خواتین اور دوشیزاؤں کیلئے اپنی طرز کا پہلا ماہنامہ

MAY 2000

# خواتین ڈائجسٹ

سالگرہ نمبر 2

فاخرہ جبیں

# یہ کہاں عشق نے ٹھہرایا ہے مجھے

digest novels lovers group ❤️❤️

نجانے کیوں آج دل اس قدر باغی ہو رہا تھا کہ وہ ہر کام خلاف معمول کیے جا رہی تھی۔ صبح ماما کی بے تحاشا ڈانٹ کے باوجود وہ ناشتا کرنے پر آمادہ نہ ہوئی تھی۔ خلاف معمول وہ اسکول دیر سے پہنچی تھی اور اپنی اس کوتاہی پر ذرا بھی شرمندہ نہ ہوئی تھی۔ (پرنسپل کی ڈانٹ کے باوجود۔) خلاف معمول ہی اس نے بریک میں پورے بیس روپے چاٹ کی پلیٹ پر خرچ کیے تھے۔ چھٹی کے وقت معمول کی عجلت سر پر سوار کیے بغیر وہ اطمینان سے اسکول سے باہر نکلی تھی۔ نہر کے پل پر بیٹھے پٹھان لڑکے سے اس نے تین روپے کا بھٹہ خریدا تھا۔ جس سے لطف اندوز ہوتے ہوئے اس نے اس تمام عرصے میں غالباً" پہلی مرتبہ نہر کے سرخ پانیوں کی لرزیدہ لہروں کو غور سے دیکھا تھا۔ فلک بوس درختوں کی پناہ میں سنسان اور ساکت سڑک پر خوفزدہ ہوئے بغیر وہ بہت سہولت کے ساتھ ہوا کی نرم سرسراہٹوں کو محسوس کرتے ہوئے مین روڈ تک آئی تھی اور یہاں آکر بھی حسب معمول نہ تو اس نے دوپٹہ پیشانی تک کھینچا تھا اور نہ ہی اس کے قدموں میں تیزی آئی تھی، بلکہ وہ یوں اطمینان کے ساتھ قدم اٹھا رہی تھی گویا بہت عرصے بعد چہل قدمی کا شوق پورا ہو رہا ہو۔ خلاف عادت اس نے نزدیک سے گزرتے ایک اسکول بوائے کو منہ بھی چڑایا تھا، جس نے جھینپ کر اپنی سرخ بائیسکل کی رفتار قدرے تیز کر دی تھی۔ تبھی اسے احساس ہوا کہ کوئی چیز اس کے پاؤں میں چبھتے ہوئے مسلسل اس کی خودساختہ تفریح میں حائل ہو رہی تھی۔

اس نے یوں ہی گردن موڑ کر دیکھا۔ مست الست "پیپلی والا سائیں" پیپل کے چوڑے تنے سے ٹیک لگائے بیٹھا تھا اور صدیوں پرانا پیپل کا درخت اسے کسی قیمتی متاع کی طرح خود میں سمیٹے پورے کا پورا اس پر جھکا ہوا تھا۔ اس کی نظریں یوں ہی بھٹکتی ہوئی سائیں کے کشکول پر جا پڑی تھیں جو غیر متوقع

## مکمل ناول

طور پر کسی بنجر زمین کی طرح ویران تھا۔

"تو گویا آج ہر کام ہی معمول کے خلاف ہو رہا ہے۔" نہ جانے کیوں سائیں کا خالی کشکول اسے بے حد مزہ دے گیا تھا۔ سینڈل بند کرنے کے بعد اٹھتے ہوئے اس نے یوں ہی کسی خیال کے تحت بیگ کے اندرونی خانے کھنگالنے شروع کر دیے۔ بیگ میں اس وقت ایک گھڑی تھی جس کا ٹوٹا ہوا اسٹریپ بدلنے کا ارادہ وہ پچھلے دو ماہ سے کر رہی تھی مگر ابھی تک اسے پایہ تکمیل تک نہ پہنچا سکی تھی۔ اس کے علاوہ ایک نیچرل پنک لپ اسٹک تھی جسے لگانے کے لیے اب اسے باقاعدہ مشقت کرنی پڑتی تھی۔ اس کے ساتھ ہی ایک مڑی تڑی چیونگم تھی اور دس روپے۔ فی الحال اس کا کل اثاثہ۔ کچھ سوچ کر اس نے پانچ روپے کا نوٹ بیگ میں سے گھسیٹا۔ مہینے کی آخری تاریخ میں ابھی دو دن باقی تھے۔

"گویا آخری دن کا کرایہ ماما سے لینا پڑے گا۔" اس نے بند مٹھی کشکول میں کھولنے سے پہلے ذرا کی ذرا "پیپلی والے سائیں" کی طرف دیکھا۔ چھوٹے چھوٹے سانپوں کی طرح لہراتی، بل کھاتی سیاہ لٹیں اس کے گلے میں جھول رہی تھیں۔ آنکھیں بند مگر ہونٹ مسکرا رہے تھے۔ اسے لگا وہ بند آنکھوں سمیت اس کی ہچکچاہٹ پر مسکرا رہا ہے۔ خجل ہوتے ہوئے اس نے بیگ میں سے دوسرا نوٹ بھی نکالا اور کشکول میں ڈال کر خود سامنے سے آتی بس پر سوار ہو گئی تھی۔

"ٹکٹ۔" کنڈیکٹر نے اس کے پاس آ کر کہا تو وہ یوں ہی اپنی خالی ہتھیلیوں پر نظریں جمائے بیٹھی رہی۔

"ٹکٹ۔" چند لمحے منتظر رہنے کے بعد کنڈیکٹر خاموشی سے اگلی سواری کی طرف سرک گیا تھا۔

"کوئی بات نہیں، کل دے دوں گی۔" طویل سانس لے کر وہ قدرے مطمئن ہو کر بیٹھ گئی تھی۔

بس سے اتر کر پانچ منٹ پیدل چلنے کے بعد وہ لکڑی کے بوسیدہ دروازے کو کھول کر سیلن زدہ دیواروں والے گھر میں داخل ہوئی تو پورا صحن سنسان سی اداسی میں اونگھ رہا تھا۔ اکتائی ہوئی زرد دھوپ دیواروں سے چپکی ہوئی تھی۔ گملوں میں لگے پام کے پودے بالکل ساکت کھڑے تھے اور انہیں دیکھ کر اسے ہمیشہ اپنے بیڈروم میں لگی اس بیلے ڈانسر کی تصویر یاد آ جاتی تھی جو دونوں ہتھیلیاں آسمان کی طرف پھیلائے ایک مخصوص زاویے میں کھڑی ہوتی تھی۔

کچن میں کھڑپٹر کے ساتھ گنگنانے کی آواز سن کر وہ دبے پاؤں آگے بڑھی تھی اور اس قدر زوردار طریقے سے سلام جھاڑا تھا کہ چولہے کے پاس کھڑا صارم اپنی جگہ سے اچھل پڑا تھا اور وہ اس کی گھبراہٹ پر بے اختیار ہنس دی تھی۔

"شرم کرو لڑکی! اگر میں بروقت سنبھل نہ جاتا تو اب تک اس کڑکڑاتے گھی میں تل چکا ہوتا۔" اس نے خفگی سے اسے گھورا۔

"تو تم سے کس نے کہا تھا کہ میری آواز سنتے ہی پھد کنا شروع کر دو۔" اس نے بیگ وہیں چھوٹی سی میز پر رکھ دیا۔

"یعنی ایک تو آپ آفت ناگہانی کی طرح نازل ہوں اور اس پر بندہ گھبرائے بھی نا۔ چہ خوب۔" صارم جلے بھنے انداز میں کہتا دوبارہ چمچہ اٹھانے لگا تھا۔

"لیکن یہ تم کر کیا رہے ہو؟" وہ دو قدم آگے بڑھی۔

"چپس بنا رہا ہوں۔ پڑھنے، لکھنے اور اونگھنے کے بعد واحد یہ کام ہے جو مجھے کرنا آتا ہے۔ ہائے۔" بات کرتے کرتے وہ ہاتھ جھٹک کر کئی قدم پیچھے ہٹ گیا تھا۔ غالباً گھی کا کوئی چھینٹا پڑ گیا تھا۔

"واقعی.... خاصے ماہر لگتے ہو اس کام میں۔" طنزیہ مسکراہٹ چہرے پہ سجائے اس نے سر تا پا صارم کو دیکھا، جس نے جینز کے پائنچے چڑھا رکھے تھے اور شرٹ کی آستینیں اور اب اپنی جلی انگلی کو جھٹکتے ہوئے زیرِ لب نہ جانے کسے کوس رہا تھا۔

"کچھ خدا کا خوف کرو۔ بھاگ کر برنال لانے کے بجائے تم کھڑی دانت نکال رہی ہو۔ شاباش ہے

بھئی۔" صارم نے جیسے اسے شرمندہ کرنا چاہا مگر وہ اپنی جگہ ڈھیٹ بنی رہی۔

"اب کہاں نکال رہی ہوں دانت۔ وہ تو میں نے بچپن میں ہی نکال لیے تھے۔"

"اول نمبر کی ڈھیٹ ہو تم۔" اس کی بے نیازی پر تاؤ کھاتے ہوئے صارم نے کھٹ سے چولہا بند کیا۔

"دیکھ لینا۔ ایک چپس بھی نہیں دوں گا تمہیں اور آلینے دو آنٹی کو، تمہاری شکایت نہ لگائی تو نام بدل دینا۔" وہ بچوں کی طرح ناراض ہونے لگا۔

"ہیں۔ ماما کہیں گئی ہوئی ہیں؟" وہ ایک دم چونکی۔

"ہاں، اماں رابیل کی طرف گئی تھیں۔ انہیں بھی ساتھ لے گئیں۔" اس نے خفا خفا سے لہجے میں آگاہ کیا۔

"اوہو، اماں رابیل کی طرف گئی ہیں تو جناب کی یہاں موجودگی کس سلسلے میں؟" رابیل کے نام پر اس کا لہجہ از خود شوخ ہو گیا تھا۔

"اماں کا خیال ہے "شریف" لڑکے اپنی ہونے والی سسرال میں نہیں جایا کرتے۔" صارم نے اپنے چہرے پہ شرافت طاری کرنے کی بھرپور کوشش کی۔

"مگر انہوں نے تو "شریف" لڑکوں کے بارے میں کہا ہو گا نا؟" اس کے شرارتی انداز پر صارم نے اسے گھورا تو پھر گھورتا ہی چلا گیا۔

"تمہاری طبیعت تو ٹھیک ہے؟ چائے بناؤں تمہارے لیے؟" اس کے متفکر لہجے پر وہ کھلکھلا کر ہنس دی تھی۔

"کیوں؟ کیا ہوا میری طبیعت کو؟"

"بھئی نہ وہ معمول کی بیزاری، نہ قنوطیت۔"

"ہاں۔ بس کبھی کبھار دل چاہتا ہے نا کہ ہر کام روٹین سے ہٹ کر کیا جائے۔ جیسے آج میرا دل چاہ رہا ہے کہ میں اس پوری کائنات کو الٹ کر رکھ دوں۔ زمین اوپر ہو اور آسمان قدموں تلے۔ اور..... اور گھڑی کی سوئیاں الٹے رخ گھومنے لگیں۔ سورج مغرب کے بجائے، مشرق کی گود میں جا گرے اور....."

"بس، بس۔ مجھے لگتا ہے، آج تم سر کے بل چلتی ہوئی آئی ہو۔" صارم نے اس کو ٹوک کر کہا۔

"ہائے واوے میزاب! کیا تم خوش ہو؟" اس نے سنجیدگی سے اس کی آنکھوں میں جھانکا۔ جیسے ننھی منی کتنی ہی سنہری کرنیں سورج کے ہالے سے پھوٹ رہی ہوں۔ ایسی ہی کوئی کیفیت اس کے چہرے پر بھی تھی۔

میزاب نے ایک نظر اسے دیکھ کر کندھے اچکا دیے۔

"معلوم نہیں، لیکن میرا دل چاہ رہا ہے خوش ہونے کو۔" اس کی بے ساختہ معصومیت پر صارم اسے بس ایک نظر دیکھ کر رہ گیا تھا۔

"اچھی بات ہے، کبھی کبھی اس معصوم کی بات مان لینی چاہیے۔" اس نے چپس کی پلیٹ اس کی طرف بڑھائی مگر اس کے نفی میں سر ہلانے پر کندھے اچکا کر باہر کی طرف قدم بڑھا دیے۔

"تم تو اب سوؤ گی نا؟" اس نے جاتے جاتے پوچھا۔

"نہیں۔ آج مجھے ایک ٹیوشن کے لیے جانا ہے۔ اگر سو گئی تو جلدی اٹھ نہیں پاؤں گی اور میں پہلے ہی دن لیٹ نہیں ہونا چاہتی۔ یو نو، فرسٹ امپریشن از دی لاسٹ امپریشن۔" اس نے دانستہ بہت عام سے لہجے میں کہا تھا مگر صارم ٹھٹک کر رک گیا تھا۔

"پلیز صارم! کچھ مت کہنا۔" اس کا ارادہ بھانپ کر وہ فوراً ہی بول اٹھی تھی۔

"یوں سمجھو کہ مجھے اس کی ضرورت ہے۔ ویسے بھی جن کے ہاں ٹیوشن پڑھانے جانا ہے وہ پرنسپل صاحبہ کے جاننے والوں میں سے ہیں اور وہ بہت اصرار کر رہی تھیں۔ کیونکہ انہیں ایک "اچھی" ٹیچر کی ضرورت ہے۔" اس نے "اچھی" پر زور دیتے ہوئے بات کو مذاق میں ٹالنا چاہا۔

صارم نے اس کی کوشش کو جانچ کر مزید کچھ کہنے کا ارادہ ملتوی کر دیا اور پھر مسکرا کر اسے وش کرتا ہوا اوپر

چلا گیا، جہاں چھت پر موجود واحد کمرہ اپنے مکین کا منتظر تھا۔

*...*...*

"بختیار ہاؤس" کا سیاہ بلند و بالا گیٹ کھلا ہوا تھا اور دوسری طرف انتہائی چوکس اور خوفناک بل ٹیریر اپنی سرخ سرخ آنکھوں سے اسے اس طرح تاڑ رہا تھا کہ وہ آگے بڑھ کر بیل بجانے کی ہمت بھی نہ کر سکی تھی۔ چوکیدار نام کی کوئی چیز یہاں موجود نہ تھی اور گزشتہ پانچ منٹ سے وہ اس خوفناک کتے اور گھر کے مالکان کو ہزار ہا کوسنوں سے نواز چکی تھی۔

گرمیوں کی طویل دوپہر اپنے اختتام تک پہنچنے کے بعد بھی اپنی ساری تپش یہیں کہیں چھوڑ گئی تھی۔ اپنے ماتھے پر آئے پسینے کو صاف کرتے ہوئے اس نے جھنجلا کر واپسی کا قصد کیا ہی تھا جب گن کاندھے پر لٹکائے عمارت کے اندرونی حصے سے چوکیدار برآمد ہوا تھا۔ طویل ڈرائیو وے عبور کرنے کے بعد اس نے سوالیہ نظروں سے میزاب کو دیکھا تو اس نے انتہائی کوفت زدہ انداز میں اپنا تعارف کروا دیا تھا۔

"اچھا، اچھا۔ جائیں جی، بیگم صاحبہ بڑی دیر سے آپ کی منتظر ہیں۔" اس کے کہنے پر وہ دو قدم آگے بڑھی تھی۔

"سنو، آج کل حالات کچھ ٹھیک نہیں۔ تمہیں گیٹ یوں کھلا نہیں چھوڑنا چاہیے تھا۔" وہ کہے بغیر نہ رہ سکی تھی۔ جواباً "چوکیدار ہلکا سا قہقہہ لگا کر ہنس دیا تھا۔

"او بی بی! یہ جو اپنا شہزادہ ہے نا" اس کا اشارہ بل ٹیریئر کی طرف تھا۔ میزاب لاحول پڑھ کر رہ گئی۔ کم از کم اس کے نزدیک شہزادے ایسے نہیں ہوتے تھے۔

"یہ بیک وقت تین چار آدمیوں کو چیر پھاڑ سکتا ہے۔ اس کی موجودگی میں کوئی بندہ کوٹھی کے قریب پھٹکنے کی جرات بھی نہیں کر سکتا۔" وہ اپنی مونچھوں کو سنوارتے ہوئے سینہ پھلا کر اس طرح بول رہا تھا۔ گویا بل ٹیریئر کا نہیں، اپنا تعارف کروا رہا ہو۔ وہ سر جھٹک کر آگے بڑھی مگر پھر رک گئی۔

"اگر یہ بیک وقت تین، چار آدمیوں کو چیر پھاڑ سکتا ہے تو میرا تو چند لمحوں میں بھرتا بنا کر رکھ دے گا۔" اس کے پرسوچ انداز پر چوکیدار نے دانت نکالتے ہوئے اس کی ذہانت کی داد دی اور اس کی بزدلی سے حظ اٹھاتے ہوئے اسے اپنی معیت میں لے کر واپس پلٹ گیا۔

"لو، بی بی! اب تمہیں کوئی خطرہ نہیں۔" چوکیدار ڈرائیو وے کے عین درمیان میں اسے چھوڑ کر آگے بڑھ گیا۔

پتھریلی سطح پر اپنے ہی جوتے کی ٹک ٹک سنتے ہوئے اس نے ڈرائیو وے کے دونوں اطراف میں پھیلے، سبز گھاس سے اٹے ہوئے لان کو دیکھا، جس کے آخری کناروں پر سرخ اور سفید گلابوں کی بہتات تھی۔ اس کے عین سامنے سفید سنگ مرمر سے بنی عمارت تھی جس کا جائزہ لیتے ہوئے اس کی بھٹکتی ہوئی نظریں ٹیرس پہ کھڑے اس شخص پر جا رکی تھیں جسے دیکھ کر اس کے قدم بے اختیار و بلا ارادہ ہی رک گئے تھے۔

وہ شخص بالکل تنہا تھا مگر ہاتھ نچا نچا کر نہ جانے کیا کچھ بول رہا تھا۔ اس کے چہرے پر شدید غیض و غضب اور اشتعال نمایاں تھا۔ یوں لگ رہا تھا جیسے وہ اپنے سامنے والے کو پھانسی پر لٹکا دینا چاہتا ہو یا اپنے ہاتھوں اسے قتل کر دینے کا ارادہ رکھتا ہو مگر "سامنے والا" تھا کہاں؟ وہاں تو سفید دیواریں تھیں یا ایک بند دروازہ یا پھر لوہے کی بنی ہوئی گرل۔

"او محترمہ! بیگم صاحبہ کمرے میں آپ کی منتظر ہیں۔" عقب میں چوکیدار کی جھنجلائی ہوئی آواز ابھری تھی۔ اس نے سٹپٹا کر اس شخص سے نظریں ہٹائیں اور تیز تیز قدموں سے برآمدے کی تین سیڑھیاں عبور کر کے سامنے والے دروازے میں گھس گئی۔ وہاں ایک متناسب قد و قامت کی خاتون سفید لباس پہنے اپنے دونوں بچوں کے ساتھ پہلے سے موجود تھیں۔ ہلکے پھلکے میک اپ میں ان کے تیکھے نقوش بے حد جاذب نظر لگ رہے تھے۔

"میرا نام میزاب ہے۔" اس نے بیٹھتے ہوئے اپنا تعارف کروایا۔

"جی۔ مسز مراد مجھے آپ کے بارے میں خاصی تفصیل سے بتا چکی ہیں۔" انہوں نے اسکول کی پرنسپل کا ذکر کیا۔

"میرا نام زوبار یہ فیضان ہے اور......" خاتون نے اپنا تعارف کروایا تھا اور اس کے ساتھ ہی ایک طویل گفتگو کا آغاز ہوا تھا جو کہ قطعی یک طرفہ تھی اور اس پوری گفتگو میں سابقہ ٹیوٹر کی غیر تسلی بخش کارکردگی اپنی بے تحاشا مصروفیت اور بچوں کی پڑھائی کا بار بار ذکر کیا گیا تھا۔

"مسز مراد آپ کی بہت تعریف کر رہی تھیں لیکن مزہ تو تب ہے ناں جب آپ ان کی کہی گئی بات کو حرف بہ حرف سچ ثابت کریں۔"

"آئی ول ڈو مائی بیسٹ میڈم (میں اپنی پوری کوشش کروں گی۔)" میزاب نے ساری بات بہت تحمل سے سن کر جواب دیا تھا۔

"اوکے پھر میں چلتی ہوں۔ بچے اپنا تعارف آپ سے خود کروالیں گے اور بچوں اپنی ٹیچر کو ہرگز تنگ نہیں کرنا۔ رائٹ۔" انہوں نے اپنا پرس سنبھالتے ہوئے دونوں بچوں کو تاکید کی جو صوفے کے ایک کونے میں گھسے آپس میں سرگوشیاں کر رہے تھے۔

ماں کی بات سن کر انہوں نے جھٹ سے اثبات میں سر ہلا دیا۔ ان کے جانے کے بعد میزاب نے ذرا کھل کر سانس لیا اور دونوں بچوں کو اپنے پاس بلالیا۔

"مائی نیم از سنان لیکن یار لوگ مجھے سنی کہتے ہیں۔" چھوٹے بچے کی آنکھوں میں شریر سی چمک تھی۔

"اینڈ آئی ایم مہران' مانی۔" بڑا نسبتاً" سنجیدہ تھا۔

میزاب کو دونوں بچے ایک ہی نظر میں اچھے لگے تھے۔ سوان سے تھوڑی سی فرینڈشپ کے بعد ابھی اس نے کتابیں کھلوائی ہی تھیں جب اچانک ہی کوئی دراز قامت شخص دروازے سے اندر داخل ہوا۔ میزاب نے سر اٹھا کر دیکھا۔ فل پولیس یونیفارم میں وجاہت و مردانگی کا شاہکار اس کے سامنے تھا۔

"پاپا!" دونوں بچے کتابیں بھول کر اس کی طرف لپکے تھے۔

"ہیلو پاپا کی جان۔" اس نے قدرے جھک کر دونوں بچوں کو اپنے مضبوط بازوؤں میں سمیٹ کر ایک ساتھ اوپر اٹھا لیا تھا اور پیار کرتے ہوئے سامنے صوفے پر براجمان ہو گیا تھا۔

"پاپا! اس دفعہ اتنے دن لگا دیے آپ نے۔" سنی نے باپ کے کندھے سے جھولتے ہوئے کیپ اتار کر اپنے سر پہ سجالی تھی۔ مانی باپ کے بال سنوارنے لگا تھا۔

"پاپا! آج ڈنر باہر ہو گا نا؟"

"پاپا! کتنے مجرم پکڑے گئے؟"

"اور کتنوں کو مار پڑی؟" سنی اور مانی چھوٹے چھوٹے سوالوں میں الجھ گئے تھے اور میزاب کی نظریں کارپٹ پر بنے ڈیزائن میں۔ جب کئی منٹ تک باپ کے ساتھ بچے بھی اسے مکمل نظرانداز کیے رہے تو وہ ٹوکے بغیر نہ رہ سکی۔

"ایکسکیوزمی سر!" اس کی نرم آواز پر انہوں نے اس طرح چونک کر اسے دیکھا تھا۔ گویا اب تک اس کی موجودگی سے بے خبر ہوں۔

"پاپا! یہ ہماری نئی ٹیچر ہیں میزاب اور ٹیچر! یہ ہمارے پاپا ہیں۔ ایس پی فیضان حسن بختیار۔" مانی نے جھٹ دونوں کو متعارف کروایا۔

"ہیلو۔" ایس پی فیضان کی آنکھوں میں ایک لمحے کے لیے حیرت کا تاثر ابھرا تھا اور پھر معدوم ہو گیا تھا۔

"ہیلو۔" میزاب نے زبردستی چہرے پہ مسکراہٹ سجا کر فارمیلٹی نبھائی تھی۔

"سر! یہ بچوں کے اسٹڈی آورز ہیں' اس لیے اگر آپ......" اس نے دانستہ بات ادھوری چھوڑ دی تھی۔

"اوہ یس۔ وائے ناٹ۔" اس نے فوراً" ہی دونوں بچوں کو گود سے اتار دیا تھا۔

"اوکے بوائز! پہلے جم کر پڑھائی کرو' اس کے بعد یہ

لاڈ پیار چلے گا۔" وہ ایک بار پھر دونوں بچوں کو پیار کر کے اٹھ کھڑا ہوا تھا۔ سنی اور مانی برے برے منہ بناتے دوبارہ کتابیں کھولنے لگے تھے۔

جب وہ "بختیار ہاؤس" سے باہر نکلی تو سلونی شام پوری طرح فضا پر اپنا ڈیرا جما چکی تھی۔ وہ صبح کی نسبت خود کو کافی تھکا ہوا محسوس کر رہی تھی۔

"محض ذرا سے چینج کے لیے میں کتنا خوار ہوئی ہوں آج۔" اس نے سیاہ کولتار کی ہموار سڑک کے کنارے چلنا شروع کر دیا تھا' جس کے دونوں اطراف کوٹھیوں کے سامنے ایک طویل قطار میں لگے یوکلپٹس کے طویل قامت درخت اس پر جھکے چلے آرہے تھے۔ گھر سے "بختیار ہاؤس" تک کا سفر اس نے پیدل ہی طے کیا تھا اور اب واپس بھی پیدل ہی جانا تھا۔ پورے وجود کی تھکن بس اس کے اٹھتے گرتے قدموں میں آکر سمٹ گئی تھی۔ نہ جانے کیوں اسے اپنے آپ پر ترس آنے لگا تھا۔ اگر اسے پچھتانے کی عادت ہوتی تو پورے دن میں خرچ کرنے والے روپوں پر ہزار مرتبہ پچھتا چکی ہوتی کہ اس وقت اگر وہی روپے بیگ میں موجود ہوتے تو اتنی مشقت نہ جھیلنی پڑتی مگر پلٹ کر دیکھنا یا گزرے ہوئے لمحوں پر نوحہ کرنا وہ کب کا بھول چکی تھی۔ جو ہے' جیسا ہے کی بنیاد پر وہ اپنی نظر بس سامنے رکھتی تھی۔

"جب قسمت کا لکھا مٹا نہیں سکتے اور تقدیر کے فیصلوں سے ٹکرانے کی ہمت نہیں تو پھر سودوزیاں کا حساب کیا رکھنا۔" گھر میں داخل ہوتے ہی اس کی سوچ اس نقطے پر آکر ختم ہو گئی تھی۔

"میزاب جانو! اتنی دیر؟" ماما بے تاب ہو کر اس کی طرف لپکی تھیں۔

"ارے! صارم نے آپ کو بتایا نہیں کہ......"

"ہاں بتایا تو تھا مگر......"

"مگر آپ پریشان ہو گئی تھیں' دل کے ہاتھوں مجبور ہو کر ہے ناں؟" اس نے خود کو ہشاش بشاش ظاہر کرنے کی پوری کوشش کی اور پھر ان کا ہاتھ تھامے کمرے میں آگئی۔

"ہاں' مجھے تمہاری بے حد فکر رہتی ہے میزاب۔" انہوں نے دونوں ہاتھوں میں اس کا چہرہ تھام لیا تھا۔

"سارا دن اسی سوچ میں گزر جاتا ہے کہ کلاس میں ڈھیر سارے چیختے' چلاتے' اودھم مچاتے بچوں کو کیسے قابو کرتی ہو گی تم؟ اور کیسے بھانت بھانت کے لوگوں کے درمیان بسوں' ویگنوں میں سفر کرتی ہو گی تم؟"

میزاب نے دیکھا۔ فکر اور پریشانی ان کے چہرے پر ثبت ہو کر رہ گئی تھی۔

"اوہ ماما! یہ کن سوچوں میں رہتی ہیں آپ۔ میں تو ایک ایک چیز کو انجوائے کرتی ہوں۔ عیش کرتی ہوں سارا دن۔ کبھی یہاں تو کبھی وہاں۔ آپ کی طرح سارا دن گھر میں بیٹھی رہوں ناں تو بیمار پڑ جاؤں۔ آپ خوامخواہ پریشان مت ہوا کریں۔" اس نے کاٹن کا دوپٹہ گول مول کر کے چارپائی پر پھینکتے ہوئے کہا۔

"تو اور کیا کروں۔ یہ بیماری تو میری جان کو چپک گئی ہے۔ ورنہ میں بھی کہیں جاب کر لیتی اور کچھ نہیں تو چھوٹا موٹا بوتیک ہی اسٹارٹ کر لیتی۔"

"چھوڑیں ماما! یہ جو کچھ ہمارے پاس ہے کیا کم ہے ہم دونوں کے لیے۔" ماما کو حساسیت کی زد میں آتے دیکھ کر وہ دھیرے دھیرے بے نیازی کے گنبد میں سمٹنے لگی تھی۔ ماما اس کی بات پر چپ چاپ سر جھکا گئی تھیں۔

وہ پاؤں جوتوں کی قید سے آزاد کر کے دیوار پر لگے میلے سے آئینے کے سامنے آکھڑی ہوئی تھی۔

"میزاب! کیا ہم ساری زندگی یونہی گزاریں گے؟" ماما کے لہجے میں یاسیت آمیز اداسی گھلی ہوئی تھی۔ اس نے پلٹ کر دیکھا۔ وہ سر جھکائے کسی غیر مرئی نقطے پر نظریں جمائے بیٹھی تھیں۔

اس نے ماما کے بدن پر ریشم و کمخواب کے سوا کوئی دوسرا کپڑا نہ دیکھا تھا مگر اب وہ انتہائی کم قیمت سوتی لباس پہنے ہوئے تھیں۔ ہیرے سے مزین جڑاؤ کنگن پہننے کی عادی کلائیاں بالکل سونی تھیں۔ سرخ و سپید بشاش چہرے نے خزاں کی ساری زردیاں اپنے نقوش

میں سمیٹ لی تھیں۔ کیوٹیکس سے سجے رہنے والے گلابی نرم و نازک ہاتھ اب کھردرے ہو رہے تھے۔ جھوٹے برتنوں کا میل کچیل ان پہ جم کے رہ گیا تھا۔ یہ وہ ماما تھیں جو پانی کا گلاس بھی مانگتی تھیں تو نوکروں کی ایک لائن ان کے سامنے آکھڑی ہوتی تھی اور اب..... اس کی آنکھیں ڈبڈبا سی گئی تھیں۔

ہائے اے وقت
یہ تیری کرشمہ سازیاں
یہ تیرے عجب نرالے کھیل

"میزاب! کیا ہم ساری زندگی یونہی گزار دیں گے؟" اس نے چونک کر ماما کو دیکھا۔ اسے لگا ماما بھی اس کی طرح حسین ماضی کی خوش رنگ تتلی کے پیچھے بھاگی ہوں گی اور جب یہ تتلی ان کے ہاتھ سے پھسل کر اڑ گئی ہوگی اور انہوں نے انگلیوں کی پوروں پر اترے چند رنگ اور اپنی خالی ہتھیلیاں دیکھی ہوں گی تو اسی کی طرح ان کا دل بھی کٹ کر رہ گیا ہوگا۔

"تو گویا میں اور ماما اتنی دیر سے ایک ہی لمحے کی دہلیز پر کھڑے تھے۔" اس سے پہلے کہ ماما ایک بار پھر اپنا سوال دہراتیں' وہ تیزی سے باہر نکل آئی تھی۔

"ماما کو کیا معلوم کہ یہ سوال تو میں ایک دن میں خود سے ہزار بار پوچھتی ہوں۔ کبھی بس اسٹاپ پر کھڑے ہو کر۔

کبھی نہر کنارے چلتے ہوئے۔

کبھی کولتار کی سیاہ سڑک کو اپنے تھکن زدہ قدموں سے روندتے ہوئے۔

کبھی بلیک بورڈ پر بچوں کو فارمولا سمجھاتے ہوئے۔

اور ہر بار ہی اس جمع' تفریق کا حاصل ایک بڑا سا سوالیہ نشان ہوتا ہے اور میں ہمیشہ سوچ میں پڑ جاتی ہوں کہ میں اس سوال کو حل بھی کر پاؤں گی کہ نہیں۔

*...*...*

سامنے لان کا منظر دیکھ کر وہ برآمدے کی سیڑھیاں اترتے ہوئے رک سی گئی تھی۔ وہ کوئی پندرہ' بیس دنوں سے متواتر یہاں آرہی تھی اور اس شخص کی حرکات اکثر ہی اسے ٹھٹکا دیتی تھیں۔ وہ شخص یا تو خبطی تھا یا پھر ذہنی مریض۔ جب ہی ہر وقت عجیب و غریب حرکات کرتا رہتا تھا اور میزاب ہمیشہ ہی اسے دیکھ کر افسوس کے احساس میں گھر جاتی تھی۔

بے شک وہ شخص انتہائی پرکشش تھا۔ عمر بھی بمشکل چھبیس' ستائیس سال تھی۔ ایسے میں اس کی دیوانوں جیسی حرکات یقیناً" بہت تکلیف دہ تھیں۔ اس وقت بھی وہ لان کے بیچوں بیچ اپنے دونوں بازو آسمان کی طرف پھیلائے کھڑا تھا۔ فاصلہ زیادہ ہونے کی وجہ سے وہ اس کے الفاظ تو نہ سن پا رہی تھی لیکن ہلتے ہوئے ہونٹ واضح طور پر دکھائی دے رہے تھے۔

اب وہ دونوں ہاتھوں کی مٹھیاں بھینچے دوزانو ہو کر زمین پہ بیٹھ گیا تھا۔ اس کے چہرے کے تاثرات بدل رہے تھے۔ اب وہ دھیرے دھیرے ہنسنے لگا تھا اور پھر یکایک ہی اس کی ہنسی فلک شگاف قہقہوں میں بدل گئی تھی۔ میزاب کا دل دکھ سے بھر گیا تھا۔ یقیناً" اس شخص پر دیوانگی کا دورہ پڑ رہا تھا۔ وہ بے تحاشا ہنستے ہوئے آگے کی جانب قدرے جھک گیا تھا اور جب اس نے سر اٹھایا تو وہ ہچکیاں لے لے کر رو رہا تھا۔

"اوہ میرے خدا۔" وہ تو ہمیشہ سے کمزور دل تھی۔ کسی بچے کی آنکھ میں آنسو دیکھ لیتی تو گھنٹوں اداس رہتی تھی اور اب اس اونچے لمبے مرد کو یوں آنسو بہاتے دیکھ کر اس کا بس نہیں چل رہا تھا کہ خود بھی جا کر اس کے ساتھ دھاڑیں مار مار کر رو دے یا پھر ننھے بچوں کی طرح اس کے بال سنوار کر اسے تھپکتے ہوئے سارے آنسو اپنے ہاتھوں سے پونچھ ڈالے۔ اس نے نچلا ہونٹ دانتوں تلے دبا کر بمشکل خود کو رونے سے باز رکھا تھا۔

تب ہی اس شخص نے ذرا سا رخ موڑ کر اس کی طرف دیکھا تو وہ اس کے یوں متوجہ ہونے پر اپنی جگہ گڑبڑا کر رہ گئی تھی۔ جبکہ دوسری طرف وہ بھی اپنی جگہ ساکت ہو گیا تھا۔ میزاب نے بیگ کے اسٹریپ کو اچھی طرح کندھے پر جماتے ہوئے قدم فوراً" آگے

بڑھا دیے۔ اگرچہ وہ کسی حد تک نفسیاتی مریض لگتا تھا مگر ایسا پاگل بھی نہ تھا کہ وہ یوں منہ اٹھائے اس کی حرکات سے لطف اندوز ہوتی رہتی۔ گیٹ کے قریب پہنچ کر اس نے پلٹ کر دیکھا۔ وہ دونوں ہاتھ پشت پر جمائے، سر جھکائے عمارت کے اندرونی حصے کی طرف جا رہا تھا۔ وہ تاسف سے سر ہلاتی گیٹ پار کر گئی تھی اور نہ جانے کیوں یہ منظر اس کے اعصاب پر اس طرح سوار ہوا تھا کہ وہ نہ صرف راستے بھر اس کے بارے میں سوچتی آئی تھی بلکہ گھر آکر چائے پیتے ہوئے اس نے بے اختیار ہی صارم سے اس کا تذکرہ بھی کر ڈالا تھا۔ جواباً وہ بھی اظہار افسوس کر کے رہ گیا تھا۔

"وہ ہے کون؟"

"ایس پی صاحب کا چھوٹا بھائی ہے۔"

"اس کا کوئی علاج وغیرہ تو ہو رہا ہو گا نا؟" وہ اس کا اترا ہوا چہرہ دیکھ کر تسلی آمیز لہجے میں کہہ رہا تھا۔

"معلوم نہیں۔ میں نے اس بارے میں کسی سے پوچھا ہی نہیں۔" اس نے کندھے اچکا کر لاعلمی کا اظہار کیا۔

"ہوں۔ میرا خیال ہے کوئی نہ کوئی علاج جاری ہو گا۔ ظاہر ہے پڑھی لکھی فیملی ہے، یوں اس کی طرف سے غفلت تو نہیں برت سکتے نا۔ خیر اگر تم اس وقت فارغ ہو تو میرا یہ نیا کالم دیکھ لو تاکہ میں شام تک اسے ایڈیٹر کی میز تک پہنچا سکوں۔" صارم نے بات بدل کر رائٹنگ ٹیبل سے اپنا کالم اٹھا کر اسے تھما دیا تھا۔ وہ ان دنوں ایک ہفتہ وار میگزین میں کالم لکھ رہا تھا۔

"میرا خیال ہے، میں نیچے جا کر ذرا تسلی سے اس کا "پوسٹ مارٹم" کرتی ہوں۔" وہ پیپرز ہاتھ میں لے کر اٹھ کھڑی ہوئی تھی اور صارم کے گھورنے کی پروا کیے بغیر مسکراتی ہوئی سیڑھیاں اتر آئی تھی۔

*...*...*

وہ تیار ہو کر کچن میں آئی تو ماما بڑی نفاست سے گول گول پراٹھے توے پر ڈال رہی تھیں۔ صارم بھی ناشتے کے لیے یہیں موجود تھا۔ وہ بھی چوکی گھسیٹ کر اس کے پاس ہی ٹک گئی۔ ماما نے خستہ سے پراٹھے پر اچار کی پھانک رکھ کر چنگیر اس کے سامنے سرکا دی تھی اور پراٹھے کی خوشبو سے ہی اس کا دل الٹنے لگا تھا۔

"معلوم نہیں کیوں۔ اتنا عرصہ گزرنے کے بعد بھی میں خود کو اس معمول کا عادی نہیں بنا سکی۔" اس نے چائے کا کپ بھر کر سامنے رکھ لیا۔

"اور یہ صارم بھی تو ہے۔ اسی پراٹھے اور اچار کے ساتھ ڈٹ کر ناشتا کرتا ہے۔"

اس نے کن اکھیوں سے کالج جانے کے لیے تیار بیٹھے صارم کو دیکھا جو ڈیڑھ دو پراٹھے اچار سے کھانے کے بعد اب مزے سے گرم چائے کی چسکیاں لے رہا تھا۔ اس نے بادل نخواستہ پراٹھے کا نوالہ توڑ کر اچار پر گھسایا اور منہ میں رکھ لیا۔

ماما نے توے پر روٹی ڈالتے ہوئے ذرا کی ذرا اس کی طرف دیکھا اور اسے بے چارگی سے نوالہ حلق سے نیچے اتارتے ہوئے دیکھ کر ان کے ہاتھ قدرے سست پڑ گئے تھے۔

"میزاب! اگر دل نہیں چاہ رہا تو انڈا بنا دوں؟" انہوں نے پکارا تو میزاب انہیں اپنی طرف متوجہ دیکھ کر سنبھلتے ہوئے مسکرا دی تھی۔

"اٹس او کے ماما!" اس نے اگلا نوالا منہ میں ڈالتے ہوئے قدرے عجلت کا مظاہرہ کیا تھا اور پھر آدھا پراٹھا صرف اور صرف ماما کی خاطر کھایا تھا۔ وہ جانتی تھی کہ نہیں کھائے گی تو ماما کا سارا کا سارا دن اسی ٹینشن میں گزر جائے گا۔

بریڈ، جیم، پورج، مکھن، انڈے، دودھ، جوس.... کیا کچھ نہیں ہوتا تھا ڈائننگ ٹیبل پر تب بھی یہ ناشتا کرتے وقت ہزار نخرے دکھاتی تھی اور اب میں نے کبھی بھولے سے بھی اسے کسی چیز پر منہ بناتے نہیں دیکھا۔ اس دفعہ تنخواہ ملے گی تو میزاب کے لیے الگ سے جیم وغیرہ منگوا کر رکھوں گی۔ ماما نے اسے جلد ہی ناشتے سے ہاتھ کھینچتے دیکھ کر سوچا تھا۔

صارم کی والدہ فردوس خالہ کی طبیعت کچھ ٹھیک نہیں تھی۔ میزاب نے جانے سے پہلے ان کا حال احوال دریافت کیا۔ حسب معمول اس کی پیشانی پر پیار کرتے ہوئے انہوں نے ڈھیروں دعائیں اس کے ساتھ کی تھیں۔ ماما باورچی خانے میں مصروف ہونے کی وجہ سے اسے دروازے تک چھوڑنے تو نہ آسکی تھیں' البتہ ان کی نظروں نے کچن کی کھڑکی سے ڈیوڑھی تک اس کا تعاقب کیا تھا۔ دروازے کے سامنے بنی دوخستہ حال سیڑھیوں پر مضبوطی سے قدم جما کر جب وہ گلی میں آئی تھی تو ایک عجیب سی بیزاری اور کوفت نے اسے سرتاپا اپنے حصار میں لے لیا تھا۔ ایک دفعہ پھر وہی راستے اس کے قدموں تلے آکر ٹھہر گئے تھے جو کبھی تو اس کے خیالوں میں مدغم ہو کر لمحوں میں سمٹ جاتے تھے اور کبھی اکتاہٹ و مایوسی کی زد میں آکر صدیوں پر محیط ہو جاتے تھے۔ وہی گلی کے موڑ پر پرچون اور پان کی دکانیں۔

وہی بس اسٹاپ پر بھانت بھانت کے لوگ۔ وہی کھٹارا سی لوکل بس اور دمے کی آخری اسٹیج پر پہنچے ہوئے مریض کی طرح ہانپتا ہوا انجن۔

وہی تیل سے چپڑے بالوں اور سرخ مفلر والا کنڈیکٹر جو دیرینہ شناسائی کی بدولت نہ صرف دانتوں کی نمائش کر کے اسے سلام کرتا تھا بلکہ اس کے لیے مخصوص سیٹ خالی کروانا بھی اپنا اولین فرض سمجھنے لگا تھا۔

اور پھر "پیپلی والا سائیں" وہی اسکول' وہی بچے' وہی شوروغل' وہی وجود میں گھر کرتی ہوئی تھکن اور جب پورے دن کی یہ مشقت بھری بیزاری اپنی انتہا کو پہنچی تو اس کی کنپٹیوں میں جیسے ہتھوڑے برسنے لگے تھے۔

"ٹیچر! آپ کی طبیعت تو ٹھیک ہے نا؟" مانی کی آواز پر وہ چونک سی گئی تھی۔ اسے دونوں ہاتھوں سے کنپٹیاں دباتے دیکھ کر وہ فکرمند سا ہو گیا تھا۔

"ہاں' بس یوں ہی ذرا سر میں درد ہے۔" اسے ٹال کر وہ سنی کی طرف متوجہ ہو گئی تھی۔ مانی فوراً" ہی وہاں سے کھسک گیا تھا اور جب واپس آیا تو ملازمہ چائے کا کپ ہاتھ میں لیے اس کے ساتھ تھی۔

"مما پاپا کے سر میں جب بھی درد ہو' وہ چائے ضرور لیتے ہیں۔"

"تھینک یو مانی!" میزاب کو اس پر ٹوٹ کر پیار آیا تھا۔ کام چونکہ ختم ہو چکا تھا اس لیے دونوں بچے کتابیں سمیٹ کر اٹھ گئے تھے اور اس وقت وہ چائے کے آخری گھونٹ لے رہی تھی جب کوئی تیزی سے سیڑھیاں اترتے ہوئے نیچے آیا تھا۔ سیڑھیاں چونکہ میزاب کے عقب میں تھیں' اس لیے وہ فوری طور پر آنے والے کو نہ دیکھ سکی تھی مگر جب قدموں کی چاپ ایک دم ہی رک گئی تو وہ پلٹ کر دیکھنے پر مجبور ہو گئی تھی۔

یہ ایس پی صاحب کا بھائی تھا۔ آخری سیڑھی پر پاؤں رکھتے ہوئے وہ غالباً" اسے دیکھ کر ہی ٹھٹکا تھا اور میزاب کو دیکھ کر اس کی آنکھوں میں جو چمک ابھری تھی' اس نے ایک ثانیے کے لیے میزاب کو چونکا کر اس کی طرف سے رخ موڑ لینے پر مجبور کر دیا تھا۔

اس نے چائے کا کپ میز پر رکھا اور اپنا بال پوائنٹ اور ڈائری بند کر کے بیگ میں رکھنے لگی۔ وہ دونوں ہاتھ پینٹ کی جیبوں میں ڈالے اس کے عین سامنے آرکا تھا اور جن گہری نگاہوں سے وہ اسے دیکھ رہا تھا' وہ ٹھٹک کر رہ گئی تھی۔

"جو کچھ بھی ہے۔ آخر ہے تو پاگل ناں اور پاگلوں سے کیا بعید۔" اسے اپنے چاروں طرف گھومتا دیکھ کر وہ دل ہی دل میں گڑبڑا کر رہ گئی تھی۔ پرس کی زپ بند کر کے اس نے فوراً" جھک کر سینڈل پہنی' جو موقع ملتے ہی وہ حسب عادت اتار چکی تھی اور ابھی وہ سیدھی بھی نہ ہوئی تھی جب وہ اچانک دھم سے اس کے برابر آبیٹھا تھا۔ اس غیر متوقع حرکت پر اس کا دل اچھل کر حلق میں آگیا۔ وہ سٹپٹا کر ایک سیکنڈ کی دیر کیے بغیر اٹھی تھی مگر وہ اگلے ہی لمحے اس کی کلائی اپنے

مضبوط ہاتھ میں لے کر ایک جھٹکے سے اسے اپنے برابر بٹھا چکا تھا۔ میزاب کو اپنے اوسان فوراً" سے پیشتر خطا ہوتے محسوس ہو رہے تھے۔ ڈرتے ڈرتے اس کی طرف دیکھا جس کے ہونٹوں پر پراسرار سی مسکراہٹ کھیل رہی تھی۔

"چھوڑو مجھے۔" اس نے بمشکل تھوک نگل کر خود کو چھڑانا چاہا۔

"دیکھو، میں تمہیں کچھ نہیں کہوں گا مگر تمہیں میری ایک بات سننی ہوگی۔" وہ بہت نرم، دوستانہ لہجے میں اس سے مخاطب تھا۔ کلائی پر گرفت البتہ جوں کی توں تھی۔ اس نے سن رکھا تھا کہ دیوانگی کی حالت میں نفسیاتی مریض غیر معمولی طاقت اور قوت کا مظاہرہ کرتے ہیں۔ سو اب اس تجربے نے اسے مزید ہراساں کر دیا تھا۔ اسے اپنی کلائی کا خون رکتا ہوا محسوس ہو رہا تھا۔

"پلیز مم... میرا ہاتھ چھوڑو۔ میں تت..... تمہاری بات سن رہی ہوں۔" میزاب کی بھرپور کوشش کے باوجود اس کی آہنی انگلیوں میں جنبش نہ ہوئی تھی۔

"سنو گی ناں؟" وہ بے یقین تھا۔

"ہاں، ہاں سنوں گی۔" میزاب کے فوری اقرار پر اس نے اس کا ہاتھ چھوڑ دیا تھا اور میزاب نے بمشکل خود کو فوری طور پر اٹھنے سے باز رکھا تھا۔

"سنو۔ اوپر میرے کمرے میں ایک لاش پڑی ہے۔" اس نے سرگوشی کی تھی۔

"کیا....؟" اس کے ہونٹوں سے نکلنے والی چیخ بے ساختہ تھی۔

"ششش..... آواز نہیں نکلنی چاہیے۔" اس نے ہونٹوں پر انگلی رکھ کر سرگوشی کے انداز میں تنبیہہ کی تھی۔ میزاب کی آنکھیں حیرت یا شاید خوف کی وجہ سے پھیل گئی تھیں۔ وہ تو اسے تھوڑا بہت نفسیاتی مریض سمجھا کرتی تھی مگر وہ تو پورے کا پورا پاگل نکلا تھا۔

"سنو..... تم جولیس کو جانتی ہو؟" وہ میزاب سے سوال کر رہا تھا جو نا سمجھی کے عالم میں منہ کھولے پھٹی پھٹی آنکھوں سے اسے دیکھے چلی جا رہی تھی۔ جو بلیک جینز، سفید براق شرٹ اور سلیقے سے بنائے گئے بالوں کے ساتھ کہیں سے بھی ذہنی طور پر کھسکا ہوا نہیں لگ رہا تھا مگر اس کی آنکھوں کی پراسرار چمک، ہونٹوں پر کھیلتی مسکراہٹ، اس کی باتیں، اس کا انداز.....

"اوہ میرے خدا۔" اسے لگا وہ بری طرح پھنس چکی ہے۔ بمشکل تھوک نگلتے ہوئے اس نے کن اکھیوں سے اپنے اطراف میں دیکھا۔ ملازمہ سنی اور مانی کے ساتھ ابھی کچھ دیر قبل ہی باہر نکلی تھی اور چوکیدار.....

"جولیس کو ماریہ سے بے حد محبت تھی۔ تم جانتی ہو، ماریہ بالکل تمہارے جیسی تھی، مگر تھی بہت اسٹوپڈ۔" وہ نہ جانے کیا کچھ کہنے جا رہا تھا میزاب کو کچھ معلوم نہ تھا۔ بلکہ اس کی سماعتیں اس قابل تھیں ہی کہاں کہ وہ کچھ سن پاتی۔ وہ تو دم سادھے کن اکھیوں سے اسے اٹھتا ہوا دیکھ رہی تھی اور جب یوں ہی بات کرتے کرتے وہ ذرا سا گھوما اور اس کی پشت میزاب کی طرف ہوئی وہ اپنی جگہ سے تھوڑا سا سرک گئی تھی پھر اسے اپنی بات میں کسی قدر منہمک جان کر اس نے پھرتی سے وہاں سے اٹھنا چاہا تھا مگر وہ اس سے زیادہ پھرتیلا نکلا تھا۔ ایک جھٹکے سے اسے دھکا دے کر واپس صوفے پر گرایا تھا اور کڑے تیوروں کے ساتھ اس پر جھک آیا تھا۔

"اب اگر تم نے اپنی جگہ سے ہلنے کی کوشش بھی کی تو یاد رکھو۔ آئی ول کل یو۔" آنکھوں میں اترتی حد درجہ خونخواریت اور وحشت نے میزاب کے پورے جسم میں سنسنی سی دوڑا دی تھی۔ بے انتہا سرد و سپاٹ آواز، لہجے کا کھردرا پن۔ میزاب کے حلق سے ابلتی چیخیں اندر ہی اندر دم توڑ گئی تھیں۔

اور معلوم نہیں بے تحاشا خوف کی حد بہادری سے جا ملی تھی یا اس کو ڈھیلا پڑتے دیکھ کر میزاب کی ہمتیں مجتمع ہوگئی تھیں۔ جب ہی تو اس نے پوری قوت سے

اس شخص کو پرے دھکیلا تھا اور خود برق رفتاری سے وہاں سے اٹھ بھاگی تھی۔ اس اندھادھند کوشش کے نتیجے میں وہ بری طرح سائیڈ ٹیبل سے ٹکرائی تھی۔ خود کو سنبھالنے کی کوشش کے باوجود وہ لڑکھڑا گئی اور دایاں ہاتھ سیدھا ان کرچیوں پر جا پڑا تھا جو سائیڈ ٹیبل سے گرنے والے گلدان کی تھیں۔ بے اختیار ہی اس کے منہ سے کراہ نکلی تھی، جس نے اسے حیران و پریشان ساکت وجود کو متحرک کر دیا تھا۔

"ارے، رکیں... جسٹ آمنٹ" وہ غالباً" اس کے پیچھے لپکا تھا مگر میزاب ایک بھی نظر اس پر ڈالے بغیر اپنی جگہ سے اٹھ کر باہر بھاگ لی تھی۔ ڈرائیو وے سے گیٹ تک کا فاصلہ اس نے پوری قوت سے بھاگتے ہوئے عبور کیا تھا۔ چوکیدار حسبِ عادت گیٹ پر موجود نہیں تھا، ورنہ اسے یوں بھاگتے دیکھ کر نہ جانے کیا سمجھتا۔

گیٹ سے باہر نکل کر طویل، سنسان سڑک بھی اس نے تقریباً" بھاگ کر ہی طے کی تھی اور جب سڑک کے اختتام پر موڑ کاٹتے ہوئے اس نے ایک درخت کا سہارا لیا تو دل سینہ توڑ کر باہر نکلنے کو بے تاب ہو رہا تھا۔ سانسیں بری طرح ایک دوسرے میں الجھ رہی تھیں اور حلق میں جیسے کانٹے سے اگ آئے تھے۔ مزید پیدل چلنے کی ہمت نہ رہی تو اس نے ہاتھ دے کر قریب سے گزرتی ٹیکسی کو روک لیا تھا۔

ایڈریس سمجھاتے ہوئے اس نے لاشعوری طور پر ڈرائیور کو بغور دیکھا تھا۔

"بیٹھیں جی۔" ڈرائیور نے اسے ایک ٹک اپنی طرف دیکھتا پا کر گڑبڑا کر کہا تھا۔ وہ ایک دم چونک گئی اور پھر خجل ہو کر دروازہ کھولنے لگی۔

"آج تو ہر شخص کی ذہنی حالت پر شبہ ہو رہا ہے۔" اس نے بیٹھتے ہوئے پریشان ہو کر سوچا تھا۔

*...*...*

"میزاب! تم کچھ روز سے زوباریہ کی طرف نہیں جا رہیں کیا؟" پرنسپل صاحبہ کے آفس میں کرسی سنبھالتے ہوئے وہ چونک سی گئی تھی۔

"اور ابھی یہ پوچھیں گی کہ کیوں نہیں جا رہی؟ تو کیا کہوں گی کہ میں ایک پاگل سے خوفزدہ..."

"تم نے بتایا نہیں میزاب! زوباریہ کا کئی مرتبہ فون آچکا ہے۔" وہ پوری طرح اس کی طرف متوجہ تھیں۔

"جی۔ وہ میری والدہ کی طبیعت کچھ ٹھیک نہیں رہتی، اس لیے۔" اس نے بلا ارادہ ہی جھوٹ بولا تھا۔

"کمال ہے بھئی، تم اس قدر غیر ذمے دار تو کبھی بھی نہیں رہیں۔ اگر مصروفیت تھی تو فون پر ہی انہیں اپنے نہ آنے کی اطلاع دے دی ہوتی اور یوں بھی ایک دو گھنٹے کی تو بات ہوتی ہے۔ اتنا سا وقت بچا کر تم کیا کرتی ہو گی۔ الٹا بچوں کی پڑھائی متاثر ہو رہی ہے۔" وہ نخوت سے اس کی غیر ذمہ داری جتا رہی تھیں۔

"میڈم! بات یہ ہے کہ میرے لیے اتنا سا وقت نکالنا بھی بہت مشکل ہے، اس لیے میں..." وہ انہیں بتانا چاہ رہی تھی کہ وہ انہیں پڑھانے نہیں

جاسکے گی مگر عین اسی وقت فون کی بیل بج اٹھی اور پھر پرنسپل صاحبہ فون پر اس طرح مصروف ہوئیں کہ وہ باقی بات کہنے کی حسرت دل میں لیے وہاں سے اٹھ گئی۔

"کیسا وقت آگیا ہے ہم پر۔ اب ایسے لوگوں کی ڈانٹ بھی سر جھکا کر سننی پڑتی ہے۔" پرنسپل صاحبہ کا لہجہ اسے راستے بھر سلگاتا رہا تھا اور اس وقت بھی اس کا منہ بنا ہوا تھا جب گلی میں داخل ہو رہی تھی۔ سامنے سے صارم کو ڈاکٹر کے ساتھ آتا دیکھ کر وہ ٹھٹھک سی گئی۔ عموماً" جب ماما کی طبیعت خراب ہوتی تھی تو اسی ڈاکٹر کو گھر بلوایا جاتا تھا۔ وہ پریشان ہو اٹھی تھی۔ قدموں کی رفتار خود بخود تیز ہو گئی تھی۔ صارم دونوں ہاتھ پشت پر باندھے غالباً" پوری توجہ سے ڈاکٹر کی بات سن رہا تھا' اسی لیے اس پر نظر پڑنے کے باوجود اس نے کسی رد عمل کا اظہار نہیں کیا تھا۔

"صارم!" قریب پہنچنے پر اس نے آہستگی سے اسے پکارا' تب وہ ذرا سا چونکا۔

"ہاں' خیریت ہے۔ تم گھر چلو' میں آتا ہوں۔"

اسے سوالیہ نظروں سے ڈاکٹر کی طرف دیکھتا پا کر اس نے تسلی آمیز لہجے میں کہا تھا مگر چہرے پر قدرے پریشانی کے تاثرات موجود تھے۔ وہ ہونٹ کاٹتی تقریباً" بھاگ کر گھر میں داخل ہوئی تھی۔ صحن اور برآمدہ خلاف معمول اس وقت بالکل خالی تھا' ورنہ عموماً" اس وقت فردوس خالہ اور ماما برآمدے میں تخت پر موجود ہوتی تھیں۔ وہ اپنا بیگ وہیں تخت پر پھینک کر کمرے کی طرف بڑھی اور جب اس نے ماما کو بستر پر نڈھال پڑے دیکھا تو دل بہت گہرائی میں ڈوب کر ابھرا تھا۔

ان کا زرد چہرہ' خشک ہونٹ' بند آنکھیں۔ ان کی کمزور سی حالت نے جیسے اس کی سب توانائیاں نچوڑلی تھیں۔

"کیا ہوا ہے؟" اس نے ڈرتے ڈرتے فردوس خالہ کو دیکھا جو ماما کے سرہانے بیٹھی بڑی محبت سے ان کے بال سہلا رہی تھیں۔ اس کی آواز پر ماما نے دھیرے سے آنکھیں کھولیں اور اس کی تسلی کے لیے نقاہت سے مسکرا دی تھیں۔

"کچھ نہیں بیٹا! بی پی بہت بڑھ گیا تھا۔ ڈاکٹر دوا دے گیا ہے۔ ابھی کچھ دیر میں بھلی چنگی ہو جائیں گی تمہاری ماما۔" خالہ نے اسے بتایا تو وہ ماما کا ہاتھ تھام کر وہیں ان کے پاس ہی ٹک گئی۔

"ڈاکٹر کہہ رہا تھا ہر وقت کا سوچنا ان کے لیے ٹھیک نہیں۔ ذہن کو سکون کی ضرورت ہے مگر یہ مانتی کہاں ہے۔ نہ ڈاکٹر کی' نہ میری۔ جب دیکھو پریشان' جب دیکھو متفکر۔ پہروں ایک ہی جگہ بیٹھ کر نہ جانے کیا تلاشتی رہتی ہے فضاؤں میں۔" خالہ کی پیار بھری ڈانٹ پر ماما دھیرے سے مسکرانے لگی تھیں۔

"میں نے تو ہزار بار کہا ہے۔ دل کی بات مجھ سے کہہ سن لیا کرو' دل کا بوجھ ہلکا ہو جاتا ہے مگر یہ "آپا" کہتی ہے' سمجھتی نہیں۔"

"ایسی بات مت کریں آپا! خدا کے بعد مجھے آپ ہی کا آسرا ہے۔" ماما نے ان کا ہاتھ تھام کر کہا تو وہ مسکرا دیں۔

"اچھا۔ میرا خیال ہے' اب میں کچھ کھانے کو لے آتی ہوں۔ بچی بھی بھوکی آئی ہے۔" ان کے جانے کے بعد ماما نے اپنی نظریں اس کے چہرے پر ٹکا دی تھیں۔

"دس از ناٹ فیئر ماما۔ (یہ درست نہیں ہے ماما۔)" اس نے آنکھوں ہی آنکھوں میں انہیں سرزنش کی۔

"آپ تو کہتی ہیں کہ آپ بہت مطمئن' بہت پرسکون ہیں۔" اس کی بات پر ماما نے یوں نظریں جھکا لی تھیں جیسے کوئی بچہ اپنی چوری پکڑے جانے پر نادم ہو۔

"ماما! آخر کیوں آپ نے ان حالات کو ذہن پہ سوار کر رکھا ہے۔ کیوں ہمہ وقت ماضی کی راکھ کریدتی رہتی ہیں جس میں چھپی چنگاریاں آپ کو لمحہ بھر میں بھسم کر کے رکھ دیتی ہیں۔ میری طرف بھی تو دیکھیے'

وہی سب کچھ میرے ساتھ بھی ہوا ہے جو آپ کے ساتھ بیتا ہے مگر میں اسے اپنی جان کا روگ بنا کر نہیں بیٹھی۔ میں آج بھی جینے کا حوصلہ رکھتی ہوں ماما اس لیے کہ میں بیتے ہوئے وقت سے بے نیاز ہو چکی ہوں اور آنے والے دنوں کو ہوّا بنا کر سر پہ سوار نہیں کر رکھا۔ آپ بھی خود کو حالات کے دھارے پر بہنے دیجیے ماما! بلیومی، جینا بہت سہل ہو جائے گا آپ کے لیے۔" وہ دھیرے دھیرے ماما کا اسٹیمنا بڑھا رہی تھی۔

"مگر کب تک کب تک ہم یوں ہی۔" آنسوؤں سے بھری لبالب آنکھیں چھلک گئیں تو وہ ہونٹ بھینچ کر رہ گئیں۔

"کیا ہوا ہے ماما ہمیں ہم اب بھی بہت سے لوگوں سے اچھی زندگی گزار رہے ہیں۔"

"کیا فردوس خالہ، صارم اور دوسرے بہت سے لوگ ہماری طرح نہیں جی رہے۔" اس نے بشاش لہجے میں ماما کی ساری مایوسی اپنے اندر جذب کر لینی چاہی تھی۔

"تم سمجھتی کیوں نہیں ہو میزاب! یہ غربت مجھے تنگ نہیں کرتی۔ یہ عسرت ہماری مجبوری ہے اور میں اس سے سمجھوتا کر چکی ہوں۔ میری فکر، میری پریشانی صرف تم ہو میزاب! تمہاری وجہ سے میری راتوں کی نیند اڑ گئی ہے۔" ان کے نم آلود لہجے پر وہ بے بسی سے ہونٹ کاٹ کر رہ گئی تھی۔

"یہ خیال میرے لیے سوہان روح بن کر رہ گیا ہے کہ اگر۔۔۔"

"ماما پلیز!" نہ جانے اسے کیا ہوا تھا کہ اس نے تڑپ کر ماما کے ہونٹوں پر اپنا ہاتھ رکھ دیا تھا۔

"اس طرح کی باتیں مت کریں۔ اپنے ساتھ ساتھ آپ مجھے بھی ناامیدی کے اندھیروں میں دھکیل دیں گی۔ میں ابھی مایوس نہیں ہوئی ماما۔" وہ انگلیاں چٹخاتی اپنی جگہ سے اٹھ کھڑی ہوئی تھی۔

"اس دنیا میں ایسا بہت کچھ ہوتا ہے، جو ہماری سوچ، خیال، ہمارے وہم و گمان میں بھی نہیں ہوتا۔ میں بھی کسی معجزے کی منتظر ہوں۔ ہو سکتا ہے ایسا ہی کوئی لمحہ ہماری زندگی میں بھی آجائے اور۔۔۔" اس نے بڑی امید سے ماما کی طرف دیکھا تھا اور شاید اس کی پریشانی کے خیال ہی سے وہ مسکرا دی تھیں۔

"ہاں ہم دونوں کو انتظار کرنا چاہیے۔"

اس نے بڑی ممنونیت سے ماما کی حوصلہ بڑھاتی نظروں کو دیکھا اور پھر پلکیں جھپک جھپک کر سارے آنسو اپنے اندر ہی اتار لیے۔

*...*...*

اگلی صبح ماما کی طبیعت کے پیش نظر وہ اسکول سے چھٹی کرنا چاہ رہی تھی مگر ماما اور فردوس خالہ کے اصرار پر وہ جانے کے لیے تیار ہو گئی تھی۔

"اوکے ماما! میں چلتی ہوں۔ اپنا خیال رکھیے گا اور ہاں، میری واپسی تک آپ کو بالکل ٹھیک ٹھاک ہونا چاہیے۔ رائٹ۔" اس کے کہنے پر ماما اثبات میں سر ہلاتے ہوئے مسکرا دی تھیں۔

"اور ہاں، اپنا دوائیوں والا نسخہ دے دیں۔ میں واپسی پر دوائیں لیتی آؤں گی۔" وہ دروازے کی طرف جاتے ہوئے پلٹی۔

"تم رہنے دو، صارم لے آئے گا۔"

"وہ بے چارہ پہلے ہی ڈھیروں ذمہ داریاں لیے پھرتا ہے۔ کم از کم جو کام ہم کر سکتے ہیں، وہ تو خود کریں۔ راستے میں کئی میڈیکل اسٹور آتے ہیں، وہاں سے لے لوں گی۔"

اس نے خود ہی نسخہ اٹھا کر بیگ میں ڈالا اور الماری کے مخصوص خانے سے پیسے نکالنے لگی، جہاں سے محض چند روپے برآمد ہونے پر وہ حیرت سے ماما کو دیکھنے لگی۔ جواباً وہ نظر چرا گئی تھیں۔

"اصل میں کل ڈاکٹر کی فیس اور دوائیوں پر جو روپے خرچ ہوئے وہ صارم کی فیس کے تھے، اس لیے میں نے جمع شدہ روپے اسے دے دیے تھے۔ وہ تو نہیں لے رہا تھا میں نے زبردستی ہی۔۔۔ خیر کوئی بات

نہیں، جب تنخواہ ملے گی پھر لے آنا۔" ماما بستر کی چادر سے نادیدہ گرد جھاڑتے ہوئے بتا رہی تھیں۔ وہ اپنی کیفیات کو اندر ہی کہیں دفن کر کے خود کو نارمل ظاہر کرتی کمرے سے باہر نکل آئی، جہاں صارم سیٹی پر کسی گانے کی دھن بجاتے ہوئے اپنی سائیکل چمکا رہا تھا۔

"ہاں بھئی بادشاہو! کدھر کے ارادے ہیں؟ کہو تو آج اس شاہی سواری پر بٹھا کر اسکول چھوڑ آؤں تمہیں؟" اسے دیکھتے ہی وہ پکار اٹھا تھا۔

"نو تھینکس۔ کیونکہ مجھے یقین ہے کہ جب ہم اسکول پہنچیں گے تو یا تو یہ سائیکل کئی حصوں میں بٹ چکی ہوگی یا پھر میں۔" وہ اطمینان سے کہہ کر آگے بڑھ آئی تھی۔ جبکہ صارم کی گھورتی نظروں نے بہت دیر تک اس کا تعاقب کیا تھا۔

"کیا کروں؟" سارا دن یہ سوال اسے وقتاً فوقتاً تنگ کرتا رہا تھا۔ تنخواہ ملنے میں ابھی کچھ دن باقی تھے اور اتنے دن دوائیاں نہ کھانے سے ظاہر ہے ماما کی طبیعت مزید خراب ہی ہوتی۔ فردوس خالہ سے ادھار لینا اس لیے مناسب نہیں تھا کہ خود ان کے پاس کوئی مستقل ذریعہ معاش نہیں تھا۔ کپڑوں کی سلائی سے گزر بسر ہوتی تھی۔ اگرچہ ٹیوشن اور تنخواہ کے ساتھ ان ماں بیٹی کا گزارہ مشکل نہ تھا مگر اس کی انا اور عزت نفس یہ گوارا نہیں کرتی تھی کہ اگر فردوس خالہ نے ہمدردی میں آ کر انہیں اپنے ہاں پناہ دے رکھی ہے تو وہ ان پر بوجھ بن کر رہ جائیں۔ سو مہینے کے آغاز میں وہ نہ صرف بجلی، گیس، پانی کے بلوں میں حصہ ڈالا کرتی تھی بلکہ گھر کا کچھ سودا سلف لا کر بقیہ رقم ماما کو تھما دیا کرتی تھی اور یہ رقم کبھی تو ماما کے علاج کی نذر ہو جاتی اور کبھی بسوں، ویگنوں کے کرائے میں کھپ جاتی۔

آخر میں اس کی سمجھ میں یہی بات آئی تھی کہ وہ ایڈوانس میں تنخواہ لے لے گی، لیکن جب پرنسپل صاحبہ نے اس کی نہایت عاجزی سے کی گئی درخواست کو چٹکیوں میں اڑا دیا تو اس کا دل چاہا کہ وہ ان کے پھولے پھولے گالوں پر تھپڑوں کی بارش کر دے۔

"اور ہاں، وہ ایس پی کی مسز کا فون آیا تھا۔ مس میزاب! یہ کیا کرتی پھر رہی ہو تم۔ اتنی چھٹیاں کرنے کا آخر مطلب کیا ہے۔ اگر نہیں پڑھا سکتیں تو جا کر اپنا حساب بیباق کرو اور انہیں جواب دے آؤ۔ وہ بے چاری کسی اور ٹیوٹر کا بندوبست کر لیں۔ بھئی میزاب! سچ تم نے تو مجھے شرمندہ کروا دیا ہے ان کے سامنے۔"

وہ بددلی سے ان کے سامنے کھڑی رہی۔ اگر اپنے خیالوں میں گم نہ ہوتی تو شاید ان کی لمبی چوڑی تقریر سنے بغیر ہی باہر نکل جاتی مگر اب ساری باتیں سر سے گزرنے کے باوجود ایک بات نے اسے چونکا دیا تھا۔

"اپنا حساب بیباق کرو۔"

"بات تو بالکل ٹھیک ہے۔ آخر میں اتنے دن پڑھاتی رہی ہوں اس کی فیس وصول کروں گی اور کہہ دوں گی کہ آئندہ پڑھانے نہیں آؤں گی۔" یہ خیال آتے ہی چھٹی کے بعد وہ "بختیار ہاؤس" کی طرف چل تو پڑی تھی مگر اس کے بلند و بالا سیاہ گیٹ پر نظر پڑتے ہی اس کے قدم خود بخود سست پڑ گئے تھے۔ اس جنونی شخص کی سرخ وحشت زدہ آنکھیں اسے گیٹ کے پیچھے سے جھانکتی ہوئی محسوس ہو رہی تھیں، جنہیں وہ اب تک بھول نہ پائی تھی۔

گیٹ کے سامنے پہنچ کر بیگ پر اس کی گرفت خود بخود مضبوط ہو گئی تھی۔ دونوں ہونٹ سختی سے بھینچے وہ اس قدر محتاط ہو کر قدم اٹھا رہی تھی گویا ابھی پلٹ کر بھاگ جانے کا ارادہ رکھتی ہو۔

"ارے میزاب بی بی!" چوکیدار کی حیرت سے بھرپور آواز نے یکلخت ہی خاموشی کا پردہ چاک کیا تو وہ ایک دم اچھل پڑی تھی۔ گیٹ کے دوسری طرف سے صاحب آواز بھی نمودار ہوا تو وہ اپنے خشک ہونٹوں پر زبان پھیرتے ہوئے بمشکل سنبھلی تھی۔

"کہاں غائب ہو گئی تھیں آپ؟ اتنے دنوں سے آئی ہی نہیں۔ بچے تو پریشان تھے ہی "بڑوں" کی بھی نیندیں اڑی ہوئی تھیں جی۔" "بڑوں" پر زور دیتے ہوئے وہ خاصا بے تکلف ہو رہا تھا۔

"سنو' اس وقت گھر میں کون کون ہے؟" میزاب نے اس کی بتیسی کو پوری طرح نظرانداز کر کے سنجیدگی سے سوال کیا۔

"سب ہی ہیں جی۔ بیگم صاحبہ' بچے اور ایس پی صاحب بھی آئے ہوئے ہیں۔" اس نے جواب دیتے ہوئے قدرے حیرت سے اسے دیکھا۔

"اچھا اور وہ پاگل' مم.... میرا مطلب ہے ایس پی صاحب کا بھائی۔" اس نے ڈرتے ڈرتے پوچھا۔

"وہ بھی گھر پر ہی ہیں۔"

"اوہ گاڈ پھر میں چلتی ہوں۔" وہ فوراً" سے پیشتر پلٹی تھی مگر چوکیدار لپک کر اس کے سامنے آگیا۔

"کہاں جا رہی ہیں آپ؟ بیگم صاحبہ اتنے دنوں سے آپ کا انتظار کر رہی ہیں۔" اس نے فوراً" اپنی وفاداری نبھائی۔

"ان سے کہہ دینا' میں پھر کسی دن آجاؤں گی۔ فی الحال مجھے دیر ہو رہی ہے۔"

"نہ جی نہ۔ اگر انہیں معلوم ہوا کہ آپ گیٹ سے ہو کر واپس گئی ہیں تو وہ مجھ پر ناراض ہوں گی۔ میں آپ کو ایسے نہیں جانے دوں گا۔" اسے اپنی جگہ ڈٹے دیکھ کر وہ تلملا گئی۔

"شٹ اپ۔ تم کس طرح روک سکتے ہو مجھے۔ میری مرضی' میں اندر جاؤں یا نہ جاؤں۔"

"دیکھیں جی۔ آپ مجھے سختی پر مجبور نہ کریں۔" چوکیدار نے سخت لہجے میں کہہ کر گن کندھے سے اتار لی تھی۔

"ہاؤ ڈیر یو۔ تت.... تم مجھ پر گن اٹھا رہے ہو۔ مجھے دھمکی دے رہے ہو۔ مائی فٹ۔" وہ دبلے پتلے چوکیدار کی اس درجہ بدتمیزی پر آگ بگولہ ہو کر رہ گئی۔ "میں بھی تمہیں یہاں سے جا کر دکھاؤں گی۔ ہمت ہے تو روک کر دکھاؤ مجھے۔"

وہ پاؤں پٹخ کر سخت لہجے میں کہتے ہوئے طوفانی انداز میں پلٹی تھی مگر عین اسی وقت ایک لمبا چوڑا وجود راہ میں حائل ہو گیا تھا۔ ایک جھٹکے سے سر اٹھا کر اس نے شرربار نگاہوں سے اس گستاخ کو دیکھنا چاہا تھا مگر یہ دیکھنا ہی قیامت ہو گیا تھا۔

"تت.... تم؟" اوپر کا سانس اوپر اور نیچے کا نیچے رہ گیا تھا۔

"ہیلو۔" بڑے دلکش انداز میں مسکراتے ہوئے اس نے قدرے جھک کر کہا تھا اور میزاب کی جان گویا پل بھر میں ہوا ہو گئی تھی۔ دل تو جیسے کچھ ثانیے کو دھڑکنا ہی بھول گیا تھا۔

"اور اگر اسے اس وقت وہ اسٹوپڈ سی ماریہ یاد آگئی تو اس دفعہ کمرے میں لٹکنے والی لاش یقیناً" میری ہی ہوگی۔" اس خیال نے اس کی رہی سہی قوتیں بھی زائل کر دی تھیں اور پھر وہ بدتمیز سا چوکیدار جو اس کے سفید پڑتے چہرے کو دیکھ کر اپنی مونچھیں مروڑنے لگا تھا۔ اس کے سامنے اپنی درگت بننے کا سوچ کر ہی وہ کانپ کر رہ گئی تھی۔

"ہاں جی' تو آپ یہاں سے جا کر دکھائیں گی۔" چوکیدار نے دانت نکالے۔

"بھئی ہم تو نہیں جانے دیں گے۔" وہ کندھے اچکا کر اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہہ رہا تھا۔

"اور باقی رہی بات ہمت کی' تو میرا خیال ہے آپ ہماری ہمت کے عظیم الشان مظاہرے کو بھولی تو نہیں ہوں گی۔" دونوں بازو سینے پر لپیٹتے ہوئے وہ ایک قدم اس کی طرف بڑھا تو اس کے سوئے سوئے حواس لمحہ بھر میں بیدار ہو گئے۔ وہ عین سامنے ڈٹا ہوا تھا اور دوسری طرف وہ چوکیدار۔

"ایس پی صاحب' بچے' بیگم صاحبہ۔" اس کے ذہن میں ایک جھماکا سا ہوا تھا۔ سامنے کا راستہ پوری طرح بلاک دیکھ کر وہ غیر محسوس انداز میں پیچھے کی طرف ہٹی تھی اور پھر پوری قوت سے گیٹ کے اندر کی طرف دوڑ لگا دی تھی۔ ڈرائیو وے اور برآمدہ عبور کرتے ہی دھاڑ سے دروازہ کھول کر وہ کمرے میں داخل ہوئی تو اپنی اپنی نشستوں پر براجمان تمام افراد بری طرح چونک گئے تھے۔

”ارے میزاب! کیا ہوا؟ خیریت تو ہے؟“ زوباریہ اسے یوں بدحواس دیکھ کر اس کی طرف لپکی تھیں۔

”واٹس پرابلم مس میزاب؟“ ایس پی فیضان سنی کو گود سے اتار کر آنکھوں میں بے تحاشا حیرت لیے اس کی طرف متوجہ ہوئے۔

”پرابلم، کوئی چھوٹی موٹی پرابلم نہیں۔ پورے چھ فٹ کی پرابلم پالی ہوئی ہے آپ نے گھر میں، دوسروں کو ہراساں کرنے کے لیے۔ اچھے محافظ ہیں آپ۔ ایک فرد آپ کے گھر میں محفوظ نہیں رہ سکتا تو باہر کے لوگوں کو آپ کیا تحفظ فراہم کرتے ہوں گے۔“ وہ ایک دم پھٹ پڑی تھی اور ایس پی صاحب اپنی جگہ ہکابکا کھڑے رہ گئے تھے۔

”اور جب آپ کو معلوم ہے کہ اس کی ذہنی حالت درست نہیں اور وہ کسی کو بھی کسی بھی قسم کا نقصان پہنچا سکتا ہے تو کیوں کھلا چھوڑ رکھا ہے اسے۔ کسی پاگل خانے میں داخل کروائیں اسے یا پھر باندھ کر رکھیں اور... اور وہ اسٹوپڈ سا چوکیدار.... اسے بات تک کرنے کی تمیز نہیں۔ ایک سے بڑھ کر ایک نمونہ موجود ہے اس گھر میں۔“

ایس پی فیضان الجھے الجھے انداز میں اپنی جگہ سے اٹھ کھڑے ہوئے تھے۔

”یہ کیا کہہ رہی ہیں آپ۔ میری تو کچھ سمجھ میں نہیں آرہا۔“

”بالکل ٹھیک کہہ رہی ہوں میں اور میری ایک بات آپ لکھ لیجیے کہ وہ خود تو پاگل ہے ہی، اپنے ساتھ ساتھ دوسروں کو بھی پاگل کرکے چھوڑے گا۔“ شدید غصے اور جھنجلاہٹ میں اس نے سارے ادب و آداب بھلادیے تھے۔

”زوباریہ فار گاڈ سیک۔ تم ہی کچھ بتاؤ، یہ سب کیا ہے؟“ وہ اس کی بے سروپا باتوں سے اکتا کر اپنی بیگم کی طرف پلٹے جو حیران و پریشان کھڑی خود بھی اس سارے قصے سے لاعلم لگ رہی تھیں۔

”کیا آپ کے گھر میں ایک سے زیادہ ذہنی مریض موجود ہیں؟“ ان کی معصومیت وان جانے پن پر وہ جھلس کر رہ گئی تھی۔

”اوہ نو، میزاب! تم کہیں ارغان کا ذکر تو نہیں کررہیں۔“ زوباریہ نے ایک دم چونک کر اس سے پوچھا۔

”اوہ گاڈ۔“ زوباریہ اپنے سر پر ہاتھ مار کر بولیں۔

”فیضی! ہونہ ہو یہ اسی شیطان کی کارستانی ہے۔“

”کیا مطلب؟“ زوباریہ کے پریقین لہجے پر ایس پی فیضان نے مستفسرانہ نگاہوں سے انہیں دیکھا۔

”شاید آپ کو یاد نہیں، کچھ روز پہلے ارغان ذکر کررہا تھا کہ وہ ایک ڈرامے میں ذہنی مریض کا کردار ادا کررہا ہے۔“

”اوہ۔“ وہ گہری سانس لے کر رہ گئے۔ ساری بات ان کی سمجھ میں آگئی تھی۔

”مس میزاب! کیا اس نے آپ کے ساتھ کوئی بدتمیزی کی ہے۔“ وہ بہت سنجیدگی سے پوچھ رہے تھے مگر میزاب ان کی طرف متوجہ ہی کہاں تھی، وہ تو زوباریہ کی مبہم مسکراہٹ اور اس مختصر سی بات میں الجھ کر رہ گئی تھی جو کسی اور ہی حقیقت کی طرف اشارہ کررہی تھی۔

”میزاب! پلیز تم ادھر بیٹھو۔“ زوباریہ اس کا ہاتھ تھام کر بہت نرمی سے مخاطب ہوئی تھیں۔

”میرا خیال ہے ارغان کی کسی شرارت کی وجہ سے تمہیں کوئی غلط فہمی ہوگئی ہے۔“

”غلط فہمی۔“ وہ غائب دماغی سے انہیں دیکھنے لگی۔ جبکہ اس کی چھٹی حس چیخ چیخ کر یہ اعلان کررہی تھی کہ آنے والے لمحے میں اسے بے وقوفی اور پاگل پن کی نہایت اعلا درجے کی سند ملنے والی ہے۔

”ان فیکٹ میزاب! ارغان کوئی سچ مچ کا پاگل یا ذہنی مریض نہیں ہے۔ اس نے حال ہی میں ایک اسٹریٹ تھیٹر جوائن کیا ہے۔ بس تب سے اس نے ہم سب کا ناک میں دم کر رکھا ہے۔ جو بھی کریکٹر اس کو ملتا ہے، گھر میں اس کی خوب ریہرسل کرتا ہے اور میرا خیال ہے موقع دیکھ کر اس نے تمہارے ساتھ بھی

کوئی شرارت کی ہوگی۔"

"شرارت۔" اس نے بے یقینی سے زوباریہ کو دیکھا۔

"کہیں ایسا تو نہیں کہ مجھے بہلا رہی ہوں یا کوئی مذاق۔" اس نے کھوجنا چاہا مگر زوباریہ کے چہرے پر اس بات کا شائبہ تک نہ تھا۔

"پکا ڈرامے باز ہے وہ۔" زوباریہ نہ جانے کیا کچھ کہہ رہی تھیں۔ اس کی نظروں میں بیک وقت کتنے ہی لمحے گھوم گئے۔

اس کے دیوانہ وار قہقہے۔

اس کا ٹوٹ کر رو دینے کا انداز۔

اس کی آنکھوں سے جھلکتی وحشت۔

اس کی خودکلامی۔

وہ سب مذاق تھا، محض شرارت، صرف ڈرامہ اور میں.....۔"

اس نے دھندلائی آنکھوں سے اپنی دائیں ہتھیلی کو دیکھا جہاں زخم پر کھرنڈ ابھی بھی موجود تھا۔ بے پناہ دکھ، شرمندگی اور خجالت آمیز بے بسی سے اس کی آنکھیں بھر آئیں۔

"پلیز! تم اس بات کو زیادہ محسوس نہ کرنا۔ وہ ایسا ہی شریر ہے۔ ہر وقت ہنسنے ہنسانے والا۔ شرارت کا کوئی موقع ہاتھ سے جانے نہیں دیتا۔" زوباریہ شرمندگی سے وضاحت کررہی تھیں۔

(ہاں، ہو گا شریر مگر مجھ سے اس کا ایسا کون سا تعلق، کون سا رشتہ تھا کہ اس نے ایسا گھٹیا مذاق کیا میرے ساتھ۔) احساس توہین سے اس کا چہرہ سرخ ہو کر رہ گیا تھا۔

"میں اسے اچھی طرح جانتی ہوں۔ اس کا مقصد تمہیں پریشان کرنا نہیں ہو گا۔ بلیو می۔ خود میں کئی بار اس کے ہاتھوں بے وقوف بن چکی ہوں۔ پتا ہے فیضی اس دن کیا ہوا؟" وہ کسی اور واقعے میں الجھ گئیں۔

(جی، اس کا مقصد مجھے محض خوفزدہ کرنا اور میرا تماشا بنا کر اس سے لطف اندوز ہونا تھا۔) اسے اپنی مضحکہ خیز حالت یاد آ گئی۔ جب وہ دیوانہ وار سڑک پر بھاگ رہی تھی اور جہاں اس کا دل پھوٹ پھوٹ کر رو دینے کو چاہا، وہاں بے اختیار ہی دل میں یہ خواہش بھی ابھری تھی کہ کہیں سے وہ بدتمیز شخص اس کے سامنے آجائے اور وہ اس کا منہ نوچ کر اس کا حلیہ بگاڑ کر رکھ دے۔

"گھر والوں کی بات کچھ اور ہوتی ہے زوباریہ! لیکن مس میزاب کے ساتھ ایسا کوئی بھی مذاق قطعی نامناسب بات ہے۔" ایس پی صاحب نے اس کے چہرے پر پھیلتی ناگواری کو بغور دیکھ کر کہا تھا۔

"میرا خیال ہے، اب میں چلتی ہوں۔" بہت ضبط کے بعد اس نے کہا تو اپنی آواز خود بھی بمشکل ہی سن سکی تھی۔

"دیکھیے میزاب! ارغان نے آپ کے ساتھ جو بھی شرارت یا بدتمیزی کی ہے، اس پر میں تو شرمندہ ہوں ہی مگر اس بات کا بھی یقین رکھیے کہ وہ خود آپ سے اس سلسلے میں معذرت کرے گا۔" ایس پی صاحب کی بھاری آواز اس کے عقب میں گونجی تھی مگر وہ کوئی بھی ریسپانس دیے بغیر مرے مرے قدموں سے باہر نکل آئی تھی۔

"ایکسکیوز می ٹیچر!" مانی کی معصوم آواز نے اسے لمحہ بھر کے لیے روک دیا تھا۔

"آپ کل آئیں گی نا؟" اسے ڈر تھا کہ چاچو کا مذاق ان کو ایک اچھی ٹیچر سے محروم کردے گا۔

"ٹیچر پلیز! پلیز آجائیے گا۔" وہ ملتجی لہجے میں اس کا ہاتھ پکڑے کہہ رہا تھا۔

میزاب نے سپاٹ سی نظروں سے اسے دیکھا اور پھر آہستگی سے اپنا ہاتھ چھڑا کر آگے بڑھ آئی۔ پختہ روش پر چلتے ہوئے اس نے پلٹ کر ٹیرس اور پھر لان کے اس مخصوص حصے کو دیکھا جہاں وہ اس نام نہاد پاگل کو اکثر و بیشتر دیوانگی کے عالم میں دیکھا کرتی تھی۔

"میزاب بی بی! اپنے قیاس اور مفروضے پر یقین کی مہر ثبت کرنے سے پہلے حالات و واقعات کو جانچنے اور پرکھنے کی ذرا سی کوشش ہی کرلی ہوتی تو آج یوں سب کے سامنے خفت تو نہ اٹھانی پڑتی۔" وہ کہیں بھی موجود

نہیں تھا مگر جیسے ہر جگہ کھڑا اس کا تمسخر اڑا رہا تھا۔ ایک طویل سانس لے کر اس نے گردن موڑ لی اور نظریں اپنے اٹھتے گرتے قدموں پر گاڑ کر آگے بڑھتی چلی گئی۔

"کیا واقعی حالات انسان کو اس قدر بدل دیتے ہیں یا پھر میں ہی بے حس ہو گئی ہوں۔" اس نے سڑک کے کنارے رک کر تیز رفتار ٹرک کو گزر جانے دیا۔

"اگر کوئی اور وقت ہوتا تو میں اس ارغان کی ایسی درگت بناتی کہ اس کی آئندہ آنے والی نسلیں بھی یاد رکھتیں اور وہ چوکیدار۔ اسے تو شاید میں گولی سے اڑا دیتی مگر اب میں نے یہ سب اس طرح برداشت کر لیا ہے جیسے یہ سب میرے ساتھ نہیں، کسی اور کے ساتھ ہوا ہو۔" اس نے بھاگ کر سڑک کراس کی اور چرچ روڈ کے گھنے سایہ دار درختوں کی پناہ میں چلنے لگی۔

"شاید اس لیے کہ بہت حد تک قصور میرا اپنا ہے۔ میں نے اپنے خیال سے آگے کچھ سوچنے، کچھ جاننے کی ضرورت ہی محسوس نہیں کی۔ اس سے بڑھ کر کم عقلی کیا ہوگی کہ میں نے اس کے متعلق جاننے کے لیے فطری تجسس کا مظاہرہ بھی نہیں کیا۔ زوباریہ، بچے، ملازم سب ہی تو تھے میرے آس پاس۔" اسے اپنی کوتاہی بری طرح کھل رہی تھی۔

"انسان کو اپنی سوچ اور خیال پر اس قدر بھی بھروسہ نہیں ہونا چاہیے کہ وہ اس کی تصدیق کی زحمت کرنا بھی گوارا نہ کرے۔" اس نے خود کو بری طرح لتاڑا۔

"چلو مان لیا کہ یہاں تک سارے کا سارا قصور میرا ہے مگر اس کے باوجود بھی اس شخص کو اتنا حق کس نے دیا تھا کہ وہ......" اس سے آگے سوچوں کی ایک یلغار تھی جو اس پر حملہ آور ہوئی تھی۔ قدموں کی رفتار کے ساتھ خون کی گردش بھی تیز تر ہو گئی تھی اور اسی حالت میں جب گھر کے سامنے پہنچ کر اس کا واسطہ بند دروازے سے پڑا تو اپنا سارا غصہ دروازے کو پیٹ کر نکالا تھا۔

"ارے ارے کیا ہو گیا، کون ہے بھئی؟" صارم نے بوکھلائے ہوئے انداز میں دروازہ کھولا تو وہ فوراً ہی اسے ایک طرف ہٹا کر اندر داخل ہو گئی۔

"معلوم بھی ہے کہ یہ وقت آنے جانے کا ہوتا ہے اس کے باوجود دروازہ یوں بند ہوتا ہے جیسے خزانے دفن ہوں یہاں۔ پہلے سڑکوں کی خاک چھان کر آؤ پھر گھنٹہ بھر دروازے کے سامنے کھڑے رہو۔" بیگ تخت پر پٹختے ہوئے اس نے سخت جلے بھنے انداز میں کہا اور پھر جوتے اتار کر ننگے پاؤں دھب دھب کرتی نلکے کی طرف بڑھ گئی۔ عقب میں صارم کی دبی دبی ہنسی کی آواز آئی تو اس نے پلٹ کر اسے گھورا۔

"اس میں ہنسنے والی کون سی بات ہے؟"

"بھئی تم تو آتے ہی یوں شروع ہو گئی ہو جیسے ایک غصیلا اور جھگڑالو شوہر دفتر سے واپسی پر سارا غصہ اپنی مسکین سی بیوی پر نکالتا ہے۔ جبکہ نہ تو تم ایک جھگڑالو شوہر ہو اور نہ میں مسکین سی بیوی۔" اس نے مسکراتے ہوئے کہا تو وہ سر جھٹک کر نلکے پر جھک گئی۔

*...*...*

"میں تو سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ آج کے زمانے میں بھی کوئی فرد اس قدر معصوم ہو سکتا ہے۔" وہ حیرت بھرے لہجے میں کہہ رہا تھا۔ میزاب نے دور آسمان پر اڑتے پرندوں سے نظریں ہٹا کر اسے دیکھا۔ سرمئی سوٹ میں چہرے پہ معصومیت لیے وہ شخص اسے زہر سے بھی زیادہ برا لگ رہا تھا۔

"میرا خیال ہے معصوم کے بجائے، بے وقوف کہنا زیادہ مناسب رہے گا۔" ارغان سمجھ نہیں سکا۔ وہ خود پر طنز کر رہی ہے یا اس پر۔ لیکن اس کے باوجود شرمندہ ہو گیا۔

"بخدا میرا یہ مقصد ہرگز نہیں تھا۔ میرا تو خیال تھا کہ تھوڑی دیر بعد میں آپ کو اصل حقیقت سے آگاہ کر کے اپنی ایکٹنگ کی داد وصول کروں گا مگر آپ تو اس بری طرح خوفزدہ ہوئیں کہ (ہمارے بھی حواس جاتے رہے) بلیو می۔ اگر مجھے ذرا سا بھی اندازہ ہوتا کہ میرے اس مذاق کے اتنے سنگین نتائج برآمد ہوں گے

تو میں......"

"میرا نہیں خیال کہ اس صورت حال کی سنگینی کسی بھی طرح آپ پر اثر انداز ہوئی ہو۔ آپ نے تو خوب انجوائے کیا ہوگا اپنی اس شرارت کو۔ اس لیے اب آپ میرا مزید وقت ضائع مت کریں۔" میزاب کے لہجے میں بلا کی سختی در آئی۔

"یہ تو آپ کہہ رہی ہیں نا۔ ذرا ہم سے پوچھیے اس ذرا سے ایکسیڈنٹ میں ہم کس کس طرح متاثر ہوئے ہیں۔ سچ بھئی رات کو نیند نہیں آتی ہمیں۔ آسمان پر رات کو جتنے بھی ستارے نکلتے ہیں' انہیں دو بار گنتا ہوں۔ تب کہیں جا کر نیند آتی ہے۔ پہلے تو دل کا چین ہی کھویا تھا' اب دل کا بھی کوئی اتا پتا نہیں۔ اوپر سے ہمارے ایس پی بھیا کی ڈانٹ ڈپٹ۔ بندہ جائے تو جائے کہاں۔"

"میری طرف سے جائیں جہنم میں مگر میرا راستہ چھوڑیں۔" میزاب کو اس کا بے ساختہ انداز ایک آنکھ نہیں بھا رہا تھا۔

"اگر اس طرح ناراض ہوں گی تو کون کافر راستہ چھوڑے گا۔" اس کی سیاہ آنکھوں میں مچلتے غصے اور خفگی کو دیکھ کر وہ بے خود سے انداز میں کہہ تو گیا' مگر اس کی خفگی کے ڈر سے فوراً" ہی زبان دانتوں تلے بھی دبالی تھی۔

"دیکھیے مسٹر ارغان! اگر آپ نے مجھے مزید تنگ کیا تو میں آپ کی شکایت ایس پی صاحب سے کروں گی۔" اسے مستقل مزاجی سے سامنے ڈٹے دیکھ کر وہ بری طرح زچ ہو رہی تھی۔

"واٹ؟ یعنی کہ آپ کا خیال ہے میں آپ کو تنگ کر رہا ہوں۔ کمال ہے' میں گھنٹے بھر سے آپ کی منت سماجت کر رہا ہوں اور آپ......"

"تو کس نے کہا ہے کہ آپ میری منت سماجت کریں۔" وہ ایک دم چیخ گئی۔ "اگر مجبوری نہ ہوتی تو شاید میں بھولے سے بھی اس گھر کا رخ نہ کرتی لیکن اگر میری ضرورت مجھے یہاں تک کھینچ لائی ہے تو بہتر ہے کہ آپ میری مجبوری سے ناجائز فائدہ اٹھانے کی کوشش مت کریں۔" شدت جذبات سے اس کا چہرہ سرخ ہو گیا تھا۔

جواباً" وہ چند لمحے ہونٹ بھینچے اسے دیکھتا رہا۔ ڈوبتے سورج کی نارنجی شعاعیں اسے اپنے حصار میں لیے ہوئے تھیں۔ ہونٹوں کو کچلتی' پلکیں تیزی سے جھپکا جھپکا کر وہ آنکھوں کی نمی کو خشک کرنے کی بھرپور جدوجہد کر رہی تھی۔ اس نے طویل سانس لے کر اس پر سے نظریں ہٹائیں اور سر جھٹکتے ہوئے اس کے راستے سے ہٹ گیا۔

*...*...*

اس روز وہ "بختیار ہاؤس" پہنچی تو پورے گھر میں اسکول کی پرنسپل مسز عامر کی آواز گونج رہی تھی۔

"یہ یہاں کیا کر رہی ہیں؟" اس نے قدرے حیرت سے سوچتے ہوئے کمرے میں قدم رکھا۔

"آؤ بھئی' آؤ میزاب۔" اسے دیکھتے ہی وہ خوشدلی سے مسکرائیں۔

"سنا ہے' بہت محنت کر رہی ہو سنی اور رانی پر۔" اس کے بیٹھتے ہی وہ گویا ہوئیں۔

"جی ہاں' یہ بچے خود ہی اتنے محنتی اور سمجھ دار ہیں کہ......" اس نے کہنا چاہا مگر مسز عامر حسب عادت اپنی کہہ چکنے کے بعد کچن سے نکلتی زوباریہ کی طرف متوجہ ہو چکی تھیں۔ وہ برا سا منہ بنا کر کتاب کے صفحے پلٹنے لگی۔

"بھئی' یہ ارغان ہے کہاں۔ سچ بھئی' میں تو اس کی طبیعت کی خرابی کا سنتے ہی بھاگی چلی آئی۔ ماشاءاللہ بڑا ہی ہنسوڑ بچہ ہے۔ محفل میں جان ڈال دینے والا۔ مجھے تو اپنے بیٹوں کی طرح ہی عزیز ہے۔"

"وہ اپنے کمرے میں ہے۔ میرا خیال ہے آپ وہیں مل لیں اس سے۔" زوباریہ کے کہنے پر وہ جھٹ اٹھ کھڑی ہوئی تھیں۔

"ارے میزاب! تم کیوں بیٹھی ہوئی ہو۔ آجاؤ ناں ارغان کی خیر خیریت پوچھ لیتے ہیں۔ عیادت کرنا تو ویسے بھی بڑے ثواب کا کام ہے۔" مسز عامر ہر کام اتنی عجلت میں کرتی تھیں کہ دوسرا انسان کسی بے بس

بچھڑے کی طرح ان کے پیچھے بندھا چلا آتا تھا۔ اس وقت بھی سیڑھیاں چڑھتے ہوئے انہوں نے اس قدر عجلت میں کہا تھا کہ جیسے وہ ارغان کی عیادت کے لیے نہ اٹھی تو شاید ساری زندگی کے لیے ثواب سے محروم کردی جائے گی۔

وہ دل ہی دل میں انہیں کوستی ہوئی چاروناچار ان کے پیچھے چل دی تھی۔ ابھی پہلی سیڑھی پر قدم رکھا ہی تھا جب فون کی بیل بج اٹھی۔ اس کے پیچھے آتی زوباریہ نے فوراً" سوپ کا پیالہ اس کے ہاتھ میں تھما دیا۔

"پلیز! یہ تم اوپر لے جاؤ۔ میں ابھی فون سن کر آتی ہوں۔" وہ معذرت خواہانہ لہجے میں کہتی پلٹ گئی تھیں۔

کمرے میں داخل ہوتے ہی سب سے پہلی نظر ارغان پر پڑی تھی۔ بڑھی ہوئی شیو' بے ترتیب بال اور آنکھوں میں بخار کی سرخی۔ لیکن ان آنکھوں میں اسے دیکھ کر لمحہ بھر کی حیرت کے بعد جو تاثر ابھرا تھا اس نے میزاب کو چونکا دیا تھا۔

"ارغان بیٹا! بالکل بھی اچھے نہیں لگ رہے یوں بستر میں لیٹے ہوئے۔ بس ختم کرو اب یہ ڈرامہ۔" مسز عامر نے اس کے بال مزید بکھرا دیے۔

"ڈرامہ کیسا آنٹی! وہ تو بس ایک دفعہ کیا تھا' تب سے اب تک لگتا ہے بددعاؤں کے حصار میں ہوں۔ اس روز ایکسیڈنٹ ہوتے ہوتے بچا تھا اور اب یہ بخار اترنے کا نام نہیں لے رہا۔" اس کا لہجہ معنی خیزی لیے ہوئے تھا' جس کو کمال خوبی سے نظرانداز کرتے ہوئے وہ دروازے کے پاس رکھی چیئر پر جم گئی۔

"بددعا کیسی۔ تمہیں تو صرف دعا ہی دی جاسکتی ہے۔" انہیں اس پر زیادہ ہی پیار آرہا تھا۔

"ارے آنٹی! ہر کوئی آپ جیسا تھوڑی ہوتا ہے۔ اوپر سے اتنا سخت' جابر' پتھر صفت اور اندر سے اتنا نرم اور گداز' بالکل موم جیسا۔"

"ہر کوئی ایسا ہی ہوتا ہے۔" مسز عامر نے جیسے کان پر سے مکھی اڑائی۔

"واقعی۔" انداز میں شوخی و شرارت لیے ہوئے اس نے میزاب کو دیکھا جو اسے مکمل طور پر نظرانداز کرکے کمرے کا جائزہ لینے لگی تھی' جو اس کی توقع کے برعکس بہت سادگی اور ترتیب لیے ہوئے تھا۔

"دیکھنے میں تو بہت لاابالی اور بے پروا سا لگتا ہے۔ مگر کمرے کی سجاوٹ سے لگتا ہے' دوہری شخصیت کا مالک ہے۔ درحقیقت بہت سلجھا ہوا' سنجیدہ و حساس مگر ظاہری طور پر۔ لیکن میں اس کا تجزیہ کرنے کیوں بیٹھ گئی ہوں۔" بک شیلف کا آنکھوں ہی آنکھوں میں جائزہ لیتے ہوئے اس نے خود کو گھر کا اور پھر کمرے کی سجاوٹ میں کھو گئی۔

اسٹیریو' کمپیوٹر' سائڈ ٹیبل پہ پڑے لیمپ اور خوبصورت ٹائم پیس کا جائزہ لیتے ہوئے اس کی بھٹکتی ہوئی نظریں بیڈ پر بکھرے کشنز اور پھر ارغان پر پڑیں تو وہ دیکھتی رہ گئی۔ جذبے لٹاتی نگاہیں نجانے کب سے اسے اپنے حصار میں لیے ہوئے تھیں۔ نظروں کا تصادم ہوتے ہی ارغان نے بڑے اطمینان سے نگاہوں کا زاویہ بدلا اور مسز عامر کی طرف متوجہ ہوگیا۔

ناگواری کی ایک شدید لہر دل میں اٹھی تو ماتھے پہ خودبخود تیوریوں کا جال سا بچھ گیا۔

"ارے میزاب! یہ سوپ ہاتھ میں لیے کیوں بیٹھی ہو۔ ارغان کو دو نا۔" اپنی ہی باتوں میں الجھی مسز عامر نے اٹھ کر کھڑکیوں کے پردے ہٹاتے ہوئے کہا تو وہ گڑبڑا کر اپنے ہاتھ میں پکڑے باؤل کو دیکھنے لگی۔

"نہیں' مس میزاب کو کھلنے دیں۔ میں بعد میں پی لوں گا۔" وہ کتنی ہی دیر سے اسے سوپ میں مسلسل چمچ گھماتے ہوئے دیکھ رہا تھا۔ سو کہے بغیر نہ رہ سکا۔ اس پر مسز عامر کے قہقہے نے اسے مزید شرمندہ کردیا۔ فوراً" ہی اپنی جگہ سے اٹھ کر اس نے پیالہ اس کی طرف بڑھا دیا۔

"کیا مطلب؟ کیا میں خود پیوں گا؟" وہ لیٹے لیٹے حیرت سے گویا ہوا۔

"تو کیا میں پلاؤں گی آپ کو؟" آواز دھیمی مگر لہجہ پھاڑ کھانے والا تھا۔

"ویسے مضائقہ تو کوئی نہیں۔" وہ ہلکے سے بڑبڑایا۔

"چلیں اور کچھ نہیں تو سہارا دے کر بٹھا ہی دیں۔" اگرچہ چہرے پر حد درجہ نقاہت طاری کرلی گئی تھی مگر آنکھوں کا تاثر اس کی شرارت کو عیاں کرگیا تھا۔ اس نے جواباً "ٹھک سے پیالہ میز پر پٹخ دیا مگر اگلے ہی پل مسز عامر کو اپنی طرف متوجہ ہوتے دیکھ کر وہ سٹپٹا گئی۔

"مم..... میرا مطلب ہے۔ اگر دل نہیں چاہ رہا تو بعد میں پی لیجیے گا۔" اسے معلوم تھا کہ اگر مسز عامر کو بھنک بھی پڑ گئی تو ابھی مریضوں کی تیمارداری پر لیکچر شروع ہوجائے گا اور اسے چپ چاپ سننا پڑے گا کہ ان کی ملازمت پر لات مارنے کے چانسز فی الحال کہیں نظر نہیں آرہے تھے۔

اس کے بات بدلنے پر ارغان کے ہونٹوں پہ بے اختیار مسکراہٹ آرکی تھی جس نے اسے مزید سلگا کر رکھ دیا تھا۔ سو فوراً "ہی "میں اب چلتی ہوں۔" کہہ کر کسی کے بھی جواب کا انتظار کیے بغیر کمرے سے نکلتی چلی گئی۔ نیچے پہنچی تو بچے کتابوں سمیت غائب تھے اور زوبار یہ فون پہ غالباً "ایس پی فیضان سے الجھ رہی تھیں۔

"لاہور پوسٹنگ کیا ہوئی' لگتا ہے پورا ملک آپ کے کندھوں پر چل رہا ہے۔ پندرہ دن ہوگئے ہیں آپ کو شکل دکھائے ہوئے۔"

میزاب نے اشارتاً "انہیں اپنے جانے کے بارے میں بتایا اور ان کے اثبات میں سرہلانے پر باہر نکل آئی۔ صبح آتے ہوئے فردوس خالہ نے اسے سلائی کڑھائی کی کچھ چیزوں کی لسٹ بنا کردی تھی۔ جن کی خریداری کے لیے اسے یہ ہی وقت مناسب لگا تھا' سو وہاں سے سیدھی بازار چلی آئی۔ خریداری کرتے ہوئے نہ چاہتے ہوئے بھی دو گہری گہری آنکھیں اسے مسلسل تنگ کرتی رہیں۔

کبھی کاؤنٹر کی چکنی سطح پر ابھر آتیں تو کبھی کسی نیون سائن کے پیچھے سے جھانکنے لگتیں۔ وہ چڑسی گئی۔

"عجیب بے وقوف سا شخص ہے وہ۔ میں نجانے کیوں سوچ رہی ہوں اسے۔" اس نے سر جھٹک کر اسے ذہن سے نکالنے کی شعوری کوشش کی۔

مطلوبہ چیزیں کافی مشقت کے بعد اس کے ہاتھ لگی تھیں اور جب وہ خریداری کے بعد مارکیٹ سے نکل کر مین روڈ تک آئی تو آسمان کے سرمئی کناروں پر ہلکی ہلکی سیاہی ابھر رہی تھی۔ گھر تک پہنچتے یقیناً "اندھیرا پھیل جاتا پھر تھکن کا غلبہ بھی تھا' سو وہ ٹیکسی کی تلاش میں ادھر ادھر دیکھنے لگی۔

بے پناہ ٹریفک' شور' ہنگامہ۔

ہر کوئی اپنے مسکن تک جلد از جلد پہنچنے کے لیے کوشاں تھا۔ اس کا انتظار کوفت میں بدلنے لگا۔ شدید بیزاری کے ساتھ اس نے دائیں بائیں نگاہ دوڑائی۔

لگا آنکھوں کے سامنے ایک جھماکا ہوا تھا۔ حد درجہ بے یقینی اور حیرت سے سر جھٹکتے ہوئے اس نے دوبارہ سڑک کے دوسری طرف جنرل اسٹور سے نکلتے شخص کو بغور دیکھا۔

بہت دیکھے بھالے مانوس سے نقوش تھے' جنہیں نظروں سے چھوتے ہی بے لوث اپنائیت کا احساس دل میں جاگزیں ہونے لگا تھا۔

"ا..... احمر۔" ہونٹوں کی بے آواز جنبش غیر ارادی تھی۔

اس شخص نے سلور گرے کرولا کا ڈور لاک کھولتے ہوئے بے نیازی سے ادھر ادھر دیکھتے ہوئے بلیک گلاسز آنکھوں پر لگالیے تھے۔

میزاب نے سینے میں اٹکی ہوئی سانس کو بمشکل کھینچا تھا۔ اسے اپنے قدموں تلے شدید ارتعاش محسوس ہوا۔

"ہاں وہی ہے' وہی ہے۔ پکارلو' بلالو۔" اس کا دل تڑپا تھا' مچلا تھا۔

"احمر.....۔" بے اختیار دو قدم آگے بڑھاتے ہوئے اس نے پوری قوت سے اسے پکارا' مگر معلوم نہیں آواز اس کے حلق سے نہیں نکل پائی یا پھر ٹریفک کے بے پناہ شور میں کہیں پھنس کر رہ گئی تھی۔ وہ

شخص بڑے آرام سے دروازہ کھول کر اپنی گاڑی میں سوار ہو چکا تھا۔

"احمر! احمر۔" گاڑی اس کے سامنے رینگنے لگی تھی۔ وہ بے تابی و بے قراری سے اسے پکارتی فٹ پاتھ سے اتر کر سڑک پر آ گئی۔

"احمر پلیز رکو' احمر۔" وہ تقریباً" چیختی ہوئی گاڑی کی طرف لپکی۔

موٹر سائیکل' رکشے' گاڑی' ویگن۔ وہ ایک ایک چیز سے بچتی' رکتی' ٹھٹکتی اس کے پیچھے بھاگی۔

احمر اس کی نظروں کے سامنے اس کی دسترس سے دور ہو رہا تھا۔ یہ خیال ہی اس کے لیے سوہان روح تھا۔

"نہیں' اب نہیں کھونے دوں گی۔" گاڑی رفتار پکڑ چکی تھی۔ وہ جنونی انداز میں گاڑی کی طرف بھاگی۔ رواں دواں سڑک پر اسے یوں دیوانہ وار بھاگتے دیکھ کر کئی ایک لوگ اس کی طرف متوجہ ہو گئے تھے۔

"احمر! رک جاؤ' پلیز۔" وہ ایک کے بعد دوسری گاڑی سے ٹکراتے ہوئے بمشکل بچی تھی مگر کب تک۔ مخالف سمت سے آتی تیز رفتار گاڑی اس طرح اس سے ٹکرائی کہ وہ اچھلتی ہوئی دور جا گری۔ بے شمار گاڑیوں کے بریک بیک وقت چرچرائے تھے۔

ایک ثانیے کے لیے جیسے ہفت آسمان اس کی نظروں کے سامنے گھوم گئے۔ درد اور تکلیف کی شدت سے نڈھال ہوتے ہوئے اس نے بمشکل اپنی بند ہوتی آنکھوں کو کھولا۔

وسیع و عریض آسمان اس کے اوپر جھکا ہوا تھا۔

گول گول گھومتے ہوئے درخت اس کے سر پر آ کے رک گئے تھے۔

رواں دواں ٹریفک ساکت ہو گئی تھی۔

چیختے چلاتے ہارن دم توڑ گئے تھے۔

پوری کائنات نے جیسے لمحہ بھر کے لیے چپ کی چادر اوڑھ لی تھی اور اس چپ میں بس اس کی پکار بازگشت بن کر گونجتی رہ گئی تھی۔

اس نے اپنی تمام تر زائل ہوتی قوتوں کو مجتمع کر کے چہرہ اوپر اٹھایا۔ کوئی گرم سیال چیز اس کی پیشانی سے بہتی ہوئی گردن تک آ رہی تھی۔ اس نے خوفزدہ نظروں سے اپنے اوپر جھک آنے والے چہروں کو اس مانوس چہرے کی تلاش میں ٹٹولنا چاہا مگر آنکھوں میں اترتی بے تحاشا دھند نے اس کی ہر کوشش کو ناکام بنا دیا۔

*...*...*

رات کا نجانے کون سا پہر تھا جب اس کی آنکھ کھلی۔ کمرے میں زیرو پاور کا بلب روشن تھا اور پنکھا بہت سست رفتار سے چل رہا تھا۔ وہ چند لمحے یونہی سامنے دیوار پر پنکھے کے گھومتے ہوئے سائے کو دیکھتی رہی پھر گردن گھما کر ساتھ والی چارپائی کی طرف دیکھا تو ماما اسے بیدار ہوتے دیکھ کر فوراً" ہی اس پر جھک آئیں۔ حلق میں کانٹے سے چبھ رہے تھے۔ اس نے خشک ہونٹوں پر زبان پھیرتے ہوئے ماما کی طرف دیکھا تو وہ فوراً" ہی اس کا مدعا سمجھ کر پانی کا گلاس بھر لائیں۔

"آپ ابھی تک سوئیں نہیں؟" اس نے گردن اونچی کر کے کھڑکی سے باہر پھیلے اندھیرے کو دیکھا۔

"سو گئی تھی۔ بس ابھی کچھ دیر پہلے ہی آنکھ کھلی تھی۔" ماما نے بہت ملائمت سے اس کے چہرے پر بکھرے بالوں کو سمیٹا تو وہ بس ایک نظر انہیں دیکھ کر رہ گئی۔

سرخ ہوتی ہوئی متورم آنکھیں گواہ تھیں کہ وہ نہ صرف رات بھر جاگتی رہی ہیں بلکہ رونے کا سلسلہ بھی جاری و ساری رہا ہے۔

"ماما! آپ کو کبھی بھی جھوٹ بولنا نہیں آیا۔" وہ زیر لب مسکرائی تو ماما نے آنکھیں چرا لیں۔

"میں اب بالکل ٹھیک ہوں ماما! اس لیے پریشان ہونا بند کریں۔ بے شک چیک کر لیجیے۔ نہ تو ٹمپریچر ہے اور نہ ہی کہیں درد ہو رہا ہے۔ اس لیے اب آپ آرام سے سو جائیں۔" اس نے ہولے سے ان کا ہاتھ دباتے ہوئے کہا۔

"ہاں' میں سو جاؤں گی مگر تم بتاؤ' بھوک تو نہیں لگ رہی۔ کچھ لاؤں کھانے کے لیے۔"

"نہیں ماما! میں بس اب سوؤں گی۔" اس نے کہنے کے ساتھ ہی کروٹ بھی بدلی تو ماما بھی اٹھ کر اپنے بستر پہ چلی گئیں۔ چند لمحوں بعد اس نے آہستگی سے آنکھیں کھول دیں کہ نیند کا آنا اب محال تھا۔ اپنے تکیے پر انگلیوں سے لکیریں کھینچتے ہوئے اس کی نظریں کھڑکی سے جھانکتے آدھے چاند پہ جا ٹکی تھیں۔

اس روز کا واقعہ اپنی تمام تر جزئیات کے ساتھ اس کے ذہن میں گھوم گیا۔ کون تھا وہ؟

محض ایک خواب، سراب، وہم یا گمان۔

"کیا وہی سچ تھا جو میری آنکھوں نے دیکھا۔" وہ بری طرح الجھ گئی۔

احمر ایک حقیقت بن کر اس کے سامنے آیا تھا مگر اب اس قدر بے یقینی تھی کہ وہ چاہتے ہوئے بھی ماما کو اس واقعے کی اصلیت سے آگاہ نہیں کر سکی تھی۔ وہ اسے محض ایک روڈ ایکسیڈنٹ سمجھ رہی تھیں۔

"کیا ہو گیا تھا مجھے۔ اس قدر بچکانہ رد عمل تھا میرا کہ حد نہیں۔ اور کچھ نہیں تو گاڑی کا نمبر ہی نوٹ کر لیتی۔ کسی رکشے، ٹیکسی پہ اس کا پیچھا ہی کر لیتی مگر یہ خیال مجھے اس وقت کیوں نہ آیا۔" اس نے بے بسی سے سر تکیے پر پٹخا۔

"کیا بات ہے میزاب؟" ماما نے شاید اس کی بے چینی بھانپ لی تھی۔

اور اس نے "کچھ نہیں۔" کہتے ہوئے بازو آنکھوں پر رکھ لیا تھا۔

کئی روز بعد وہ گھر سے نکلی تو ماما نے نجانے کیا کچھ پڑھ کر اس پر پھونک ڈالا تھا۔ فردوس خالہ ان کی چاہت و محبت دیکھ کر مسکراتی رہیں۔ جبکہ صارم دہائیاں دیتا رہا۔

"خدارا آنٹی جی! کچھ پھونکیں میرے لیے بھی بچا رکھیں۔ میں بھی اپنی ماں کا اکلوتا بیٹا ہوں۔" اور وہ ہنس ہنس کر اسے مزید جلاتی رہی۔

"پیپلی والے سائیں" نے اسے دیکھتے ہی اس زور کی بڑھک ماری تھی کہ وہ اپنی جگہ کانپ کر رہ گئی تھی۔ وہ بولا کچھ نہیں، بس جلالی آنکھوں میں چمک اور ہونٹوں پر مسکراہٹ لیے اسے دیکھتا رہا۔ وہ بھی چپ چاپ سر جھکائے اس کے قریب سے گزرتی چلی گئی۔ پورے دن میں جتنی بھی گاڑیاں اس کے پاس سے گزریں وہ لاشعوری طور پر ان کے اندر جھانکتی رہی۔

"ایسا بھی تو ہو سکتا ہے کہ مجھے دھوکا ہی ہوا ہو۔" وہ ان ہی سوچوں میں غلطاں و پیچاں تھی۔ جب اس کے انتہائی نزدیک آ کر رکتی گاڑی کا ہارن بج اٹھا۔ وہ بری طرح چونک کر گاڑی کی طرف پلٹی اور غیر متوقع طور پر ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھے ارغان کو دیکھ کر اس کا موڈ خوامخواہ ہی بگڑ گیا۔

"کہاں جا رہی ہیں؟ آئیے میں آپ کو ڈراپ کر دیتا ہوں۔" کھڑکی سے سر نکالے وہ اپنے مخصوص جان دار لہجے میں اسے آفر کر رہا تھا۔

"نو تھینکس۔ میں چلی جاؤں گی۔" وہ رکھائی سے جواب دے کر آگے بڑھ گئی۔

"میرا خیال ہے، آپ خوامخواہ تکلف برت رہی ہیں۔ آجائیے، میں بھی گھر ہی جا رہا ہوں۔ غالباً" آپ کو بھی تو وہیں جانا ہے۔ وقت تو......"

"جی بالکل وہیں جانا ہے اور ویسے ہی جاؤں گی جیسے روز جایا کرتی ہوں۔ آپ کو تکلیف اٹھانے کی ضرورت نہیں۔" اس نے سختی سے منع کر دیا۔ جانتی تھی گاڑی میں بیٹھنا گویا اسے سر پہ سوار کر لینا ہے۔

"تکلیف کیسی؟ آپ کو کون سا گاڑی کے بجائے میرے کندھوں پر سوار ہونا ہے۔" وہ ڈھٹائی سے مسکرایا۔

"شٹ اپ مسٹر! میں نے کہہ دیا نا، میں خود چلی جاؤں گی۔ اس لیے بہتر ہے کہ اب آپ اپنا راستہ ناپیے۔" اس کے سختی سے ڈانٹنے پر اس نے برا سا منہ بنا کر کندھے اچکا دیے۔

"اوکے ایز یو وش۔ لیکن اتنا بتا دوں کہ ہر صورت میں نقصان آپ ہی کا ہو گا۔"

وہ سنی ان سنی کرتی، لب بھینچے آگے بڑھتی رہی۔ تب اس نے گلاسز چڑھائے اور تیز رفتاری سے گاڑی آگے بڑھا لے گیا اور وہ جلتی بھنتی اس حبس زدہ موسم

میں پیدل مارچ کرتے ہوئے بالآخر "بختیار ہاؤس" پہنچ ہی گئی۔ وہاں اے سی لگے روم میں داخل ہوتے ہوئے فوری طور پر تو اسے کچھ نظر نہیں آیا مگر جب چند لمحوں بعد کمرے کا ماحول واضح ہوا تو اسے لگا باہر کی ساری تپش اسی کمرے میں جمع ہونے لگی ہے۔ کتنے آرام سے وہ سامنے صوفے پر بیٹھا کسی رسالے کی ورق گردانی کر رہا تھا۔

تب ہی ملازمہ ہاتھ میں چائے اور دیگر لوازمات سے بھری ٹرے لے کر کمرے میں داخل ہوئی تو اس نے اسے فوراً "سنی اور مانی کو بلانے کے لیے کہہ ڈالا۔

"جی وہ تو گھر پر نہیں ہیں۔"

"کہاں گئے ہیں؟" اس نے اچنبھے سے ملازمہ کو دیکھا۔

"وہ تو پنڈی گئے ہوئے ہیں اپنے ماموں کے ساتھ۔"

"کیا؟ مگر......" اس نے حیرت سے ارغان کو دیکھا جو ملازمہ کو جانے کا اشارہ کرکے اپنی پلیٹ میں پیسٹری اور پزا کا مینار کھڑا کر رہا تھا۔

"آپ' آپ نے مجھے بتایا کیوں نہیں؟"

"کیا؟" اس کی حد درجہ معصومیت کے اظہار پر وہ کلس کر رہ گئی۔

"یہی کہ سنی اور مانی پنڈی گئے ہوئے ہیں۔"

"آپ نے مجھ سے پوچھا کب تھا؟" وہ بڑے مزے سے سارا قصور اس پر ڈال گیا تو اس کا دل چاہا کہ اس کمرے میں جتنے بھی میٹل پیسز پڑے ہیں' ایک ایک کرکے اس کے سر پہ دے مارے۔

"آخر آپ! آپ کیوں کرتے ہیں ایسی حرکتیں۔ آپ کو معلوم ہے میں اتنی دور سے پیدل چل کر آرہی ہوں یہاں تک صرف سنی اور مانی کو پڑھانے کے لیے۔" وہ روہانسے لہجے میں چیخ پڑی تھی۔

"شاید آپ بھول رہی ہیں۔ میں نے آپ کو لفٹ کی آفر دی تھی۔"

"تو آپ نے مجھ سے صرف اس بات کا بدلہ لیا ہے کہ میں نے آپ کی آفر قبول نہیں کی۔"

"ہرگز نہیں محترمہ! آپ بات کو غلط رنگ دے رہی ہیں۔" اسے شدید قسم کی غلط فہمی کا شکار ہوتے دیکھ کر اس نے تیزی سے وضاحت کی۔

"میں آپ سے ایک ضروری بات کرنا چاہتا تھا اس لیے......"

"مجھے یقین ہے ارغان صاحب! آپ کی باتیں بھی آپ کی طرح نہایت غیر ضروری اور بودی قسم کی ہوں گی۔ اس لیے میں یہاں ایک منٹ بھی نہیں رک سکتی۔" وہ زہرخند لہجے میں کہتی اٹھ کھڑی ہوئی۔

"مس میزاب! آپ میری بات سنیں بغیر نہیں جائیں گی۔"

"آپ مجھے زبردستی نہیں روک سکتے۔" ارغان کے قطعی لہجے پر وہ بھی فیصلہ کن انداز میں دروازے کی طرف بڑھی تھی۔

"چلیں یہ بھی کر دیکھیں۔" وہ اطمینان سے سیٹی بجاتے ہوئے اٹھ کھڑا ہوا اور ابھی میزاب نے دروازے سے باہر جانے کے لیے قدم رکھا ہی تھا کہ نجانے کہاں سے وہ بل ٹیریئر بھاگتا ہوا آیا اور اس کے سامنے جم کر غرانے لگا۔ اس اچانک افتاد پر وہ بری طرح بوکھلا کر پیچھے ہٹ گئی۔

"یہ...... یہ کیا بدتمیزی ہے؟" وہ خوفزدہ انداز میں چلائی۔

"بدتمیزی نہیں' یہ ٹائیگر ہے۔ سانس بھی اپنے مالک کے حکم سے لیتا ہے۔ اس لیے میرا خیال ہے آپ اس کی وفاداری کو چیلنج کیے بغیر آرام سے بیٹھیں اور میری بات سن لیں۔"

میزاب نے کھا جانے والی نظروں سے اسے دیکھا جواب بڑے آرام سے چائے کا کپ تیار کر رہا تھا۔

"چینی کتنی لیں گی؟" وہ دوستانہ انداز میں مخاطب تھا۔ یوں جیسے کچھ ہوا ہی نہ ہو۔

"ہائے اللہ' کس قدر ڈھیٹ شخص ہے یہ۔ کسی بات کا اثر ہی نہیں ہوتا اس پر۔" وہ گرنے کے سے انداز میں صوفے پر بیٹھ گئی۔ انداز میں شدید قسم کی بے چارگی تھی اور چہرے سے یوں لگ رہا تھا جیسے ابھی

پھوٹ پھوٹ کر رو دے گی۔ ارغان کو اس لمحے بے تحاشا ندامت کا احساس ہوا تھا۔

"آئی ایم سوری۔ اصل میں...."

"آپ نے جو کہنا ہو جلدی کہیے۔ میں منتظر ہوں۔" اس کا سپاٹ لہجہ ارغان کو بھی سنجیدگی اختیار کرنے پر مجبور کر گیا تھا۔

(کہنے کو بہت کچھ ہے مگر ڈرتا ہوں۔ تم تو میری پہلی غلطی ہی معاف نہیں کر سکیں اور میری کم عقلی و نادانی کہ پے در پے غلطیاں کیے جا رہا ہوں۔ شاید اس لیے کہ اظہار کے موزوں طریقے سے ناآشنا ہوں یا پھر محبت کرنے کا تجربہ ہی نہیں مجھے۔ چاہتا ہوں جو کچھ دل میں ہے وہ خود بخود جان لو۔ کچھ کہنے، کچھ بتانے کی نوبت ہی نہ آئے مگر....) وہ بے قراری سے اپنی جگہ سے اٹھ کھڑا ہوا تھا۔

لحاتی مگر بے معنی خاموشی سے اکتا کر میزاب نے اس کی طرف دیکھا۔ بالوں میں بے وجہ انگلیاں پھیرتے ہوئے، لب بھینچے وہ اسے خاصا مضطرب لگا تھا۔ اس سے پہلے کہ وہ کچھ کہہ کر اسے اپنی طرف متوجہ کرتی، وہ اچانک اس کی طرف پلٹا تھا۔

"میزاب! تم نے کبھی کسی سے محبت کی ہے؟"

آپ سے تم تک کا تخاطب اور اس پر غیر متوقع سوال۔ میزاب کی خاموش نگاہیں اس کے چہرے پہ عیاں الجھن کو کھوجتی رہ گئیں۔

"بتاؤ ناں میزاب! تم نے کبھی محبت کی ہے۔ بہت ٹوٹ کر، بہت شدت سے۔ اپنے تمام تر جذبوں کے ساتھ، تم نے چاہا ہے کسی کو؟" وہ اس کے عین سامنے آکر ٹھہر گیا تھا۔

وہ مسمریزم کی کیفیت میں بیٹھی رہ گئی۔ چاہنے کے باوجود نہ اپنی پلکوں کو جنبش دے سکی، نہ اس پر سے نظریں ہٹا سکی۔ ہاں البتہ انگلیوں کی سرد ہوتی پوروں پر اترتی کپکپاہٹ اسے بخوبی محسوس ہوئی تھی۔

"تم نے محبت کی ہو یا نہیں مگر میزاب! میں نے کی ہے۔ بے تحاشا محبت کی ہے۔ عشق کی سرحدوں کو چھوتی ہوئی محبت، اپنے جذبوں کی عمیق گہرائیوں اور دل و جان کی تمام تر سچائیوں کے ساتھ چاہا ہے۔ جانتی ہو کسے؟"

وہ اس کے عین سامنے پنجوں کے بل بیٹھا اس کی کھلی آنکھوں میں جھانکتے اپنے واضح عکس کو دیکھ رہا تھا۔ نگاہوں سے لپکتے والہانہ جذبوں کی تپش نے میزاب کو جیسے اندر تک پگھلا دیا تھا۔ اس نے اپنی برف ہوتی انگلیوں کو نم ہتھیلیوں میں چھپا کر دل کے تمام دروازے سختی سے بند کرنے چاہے مگر شاید یہ ہی وہ لمحہ تھا جب محبت کی دیوی بڑی خود سری سے اس کے دل کے سنگھاسن پر براجمان ہو گئی تھی۔ محبت ایک الہام کی صورت دل کے تاروں کو چھو رہی تھی کہ دفعتاً ایک خیال بچھو بن کر اسے ڈس گیا۔

امانت میں خیانت۔

جذبوں میں چوری۔

وہ سراپا کانپ گئی۔ ارغان نے کچھ کہنے کے لیے لب وا کیے تھے مگر اس نے سختی سے اپنا ہاتھ اس کے ہونٹوں پر رکھ دیا۔

"نہیں، پلیز اور کچھ مت کہنا۔ خاموش رہو۔" وہ اس لمحے اپنے آپ سے بے حد خوفزدہ ہو گئی تھی۔ اس کے زرد ہوتے چہرے اور تھرتھراتے لب دیکھ کر ارغان ایک پل میں اپنے حواسوں میں آگیا تھا۔ ایک اور "غلطی" کا احساس اس پر حاوی ہونے لگا۔

"مم.... میں اور کچھ نہیں سنوں گی۔ مجھے ابھی اور اسی وقت جانا ہے۔" بجلی کی سی تیزی سے اپنا ہاتھ واپس کھینچتے ہوئے وہ اٹھی تو ارغان بھی فوراً اس کے پیچھے لپکا تھا اور غالباً اسے دیکھ کر ہی ٹائیگر نے راستہ چھوڑ دیا تھا۔ وہ تیز تیز قدم اٹھاتی لمحوں میں نظروں سے اوجھل ہو گئی تھی۔

جبکہ وہ وہیں ساکت و صامت کھڑا رہ گیا۔ اسے شدت سے احساس ہو رہا تھا کہ اس نے میزاب سے وہ نہیں کہا جو اسے کہنا تھا۔ بلکہ وہ کہہ دیا ہے جسے چھپانے کی سعی وہ اس تمام عرصے میں کرتا رہا تھا۔

*...*...*

کبھی چاند چہروں کی بھیڑ سے نکل کر آیا تو یہ کھلا
وہ جو اصل تھا اسے کھو دیا جسے پا لیا کوئی اور ہے
کئی عمر اسی کی چاہ میں اسے دیکھنے کی راہ میں
مگر اک زمانے کے بعد جو ہوا آشنا کوئی اور ہے

آج کا سورج افق کے بجائے اس کی آنکھوں میں ڈوبا تھا۔ نجانے کیسا کرب، کیسی بے قراری تھی جو جسم کے روئیں روئیں میں ٹھہر کر روح کو ایک نئے عذاب سے دوچار کر گئی تھی۔

"یہ سب نہیں ہونا چاہیے تھا۔" سیاہ رات کی اس لامحدود چپ پر اس کے آنسوؤں کی آواز ثبت ہو کر رہ گئی تھی۔ گزرے ہوئے تمام واقعات اسے احساس دلا رہے تھے کہ وہ اس شخص کی خطاؤں بھری معصومیت سے نفرت تو کبھی بھی نہ کرتی تھی۔ بس ایک گریز تھا۔ ایک حد بندی تھی جو اس نے لاشعوری طور پر خود پہ لاگو کر رکھی تھی اور جسے ختم کر دینے میں اس شخص نے ایک پل بھی نہیں لگایا تھا۔

"وہ تو لاعلم ہے۔ کچھ نہیں جانتا اور میں باخبر ہوتے ہوئے بھی بہک گئی۔ سب کچھ جانتے بوجھتے بھی یہ دل اپنی من مانی کر ہی گیا مگر مزید ڈھیل نہیں دوں گی اسے۔ آئندہ اس گھر کے راستے پہ قدم پڑنے ہی نہیں دوں گی۔" دل میں مصمم ارادہ کرتے ہوئے اس نے سختی سے آنکھیں بند کیں تو رات کے رخسار نم ہوتے چلے گئے۔

*...*...*

مسز عامر کے چھوٹے بیٹے کی منگنی تھی اور انہوں نے پورے اسٹاف کو مدعو کر رکھا تھا۔ اس کا ارادہ نہ جانے کا تھا مگر ماما جو اسے کئی دنوں سے پژمردہ اور بیزار سی دیکھ رہی تھیں، اس کے بہل جانے کے خیال سے زبردستی اسے جانے پر رضامند کر رہی تھیں۔ فردوس خالہ صارم کے ساتھ اوکاڑہ گئی ہوئی تھیں۔ اسی وجہ سے گھر کی خاموشی بھی کاٹ کھانے کو دوڑتی تھی۔ ساتھی ٹیچرز کا بھی اصرار تھا۔ وہ جانے کو تیار تو ہو گئی تھی مگر خاصی بے دلی سے۔ کہ ارغان کا سامنا کرنے سے گریزاں تھی مگر صد شکر کہ تقریب میں ان کی فیملی کا کوئی فرد بھی شامل نہ تھا۔ مسز عامر کی زبانی ہی معلوم ہوا کہ زوباریہ ابھی تک پنڈی سے واپس نہیں آئی تھیں اور وہ دونوں بھائی کسی ضروری کام کی وجہ سے شرکت نہ کر سکے تھے۔

تقریب ابھی جاری تھی، مگر وہ گہری پڑتی شام کو دیکھ کر وہاں سے اٹھ آئی۔ مسز عامر کا گھر اور "بختیار ہاؤس" قدرے فاصلے پر مگر ایک ہی روڈ پر تھے۔ مین روڈ تک جانے کے لیے اسے لامحالہ بختیار ہاؤس کے سامنے سے گزرنا تھا اور یہ ہی لمحہ اس پر سب سے بھاری تھا۔ سیاہ بلند و بالا گیٹ پر نظر پڑتے ہی اس کا دل جس بے ترتیبی سے دھڑکا اس سے وہ مزید پریشان ہو گئی۔ نچلا ہونٹ دانتوں تلے کچلتے ہوئے اس نے اپنے قدموں کی رفتار خاصی تیز کر دی تھی۔ یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے ابھی گیٹ کھلے گا اور وہ ڈارک براؤن آنکھوں میں بے تحاشا چمک لیے اس کے سامنے آ کھڑا ہو گا اور پوچھے گا۔ "میزاب! تم نے کبھی کسی سے محبت کی ہے۔"

اس نے سر جھٹک کر ارغان سے متعلق ہر خیال کو ذہن سے نکالنے کی شعوری کوشش کی اور عین اس وقت جب وہ "بختیار ہاؤس" کے سامنے سے گزر رہی تھی۔ سیاہ گیٹ پوری طرح کھل گیا تھا۔ گاڑی سست روی سے رینگتی ہوئی باہر نکلی تھی۔ میزاب نے اپنی نظریں سختی سے اپنے اٹھتے گرتے قدموں پر جما دیں اور جب گاڑی اس کے نزدیک سے گزرنے لگی تب اس نے کن اکھیوں سے ڈرائیونگ سیٹ کی طرف دیکھا اور وہاں بیٹھے شخص کے چہرے پر نگاہ پڑتے ہی کوئی بجلی تھی جو اس کے دل و دماغ میں کوندی تھی۔ ذہن و دل ایک لمحے کے لیے مفلوج ہو کر اسے پتھرا سے گئے تھے۔

وہ بلاشبہ احمر ہی تھا۔ اس نے گاڑی کے پیچھے دوڑنے کو قدم اٹھایا مگر ٹھٹک گئی احمر کو پکارنے کی کوشش میں اس کے ہونٹ بس تھرتھرا کر رہ گئے تھے۔ اس نے ایک تیز نظر اپنی دسترس سے دور جاتی گاڑی کو دیکھا اور دوسری "بختیار ہاؤس" کے بند

ہوتے گیٹ پر۔ بس ایک لمحہ لگا تھا فیصلے میں اور اگلے ہی پل وہ سیاہ گیٹ کو دھکیل کر اندر داخل ہو گئی تھی۔

"ارے میزاب بی بی!" چوکیدار نے حیران ہوتے ہوئے کچھ کہنا چاہا مگر اس نے سننے کی زحمت نہیں کی۔

"سنو' یہ... یہ جو ابھی گاڑی میں گئے ہیں احمر' یہ یہاں کس سے ملنے آئے تھے۔" وہ بے حد عجلت میں پوچھ رہی تھی۔

"ایس پی صاحب کے مہمان تھے مگر......"

"ایس پی صاحب کہاں ہیں؟" وہ جیسے اپنے آپ میں نہیں تھی۔

"وہ تو اندر ہیں مگر......" چوکیدار اس کی گھبراہٹ پر بوکھلاہٹ کا شکار ہو گیا تھا۔ وہ اس کا جواب سنتے ہی کمرے کی طرف دوڑی۔ چوکیدار بس پیچھے سے اسے پکارتا ہی رہ گیا تھا۔

کمرے کا دروازہ دھاڑ سے کھلا تھا اور سینٹرل ٹیبل پہ رکھے کاغذات پر جھکے تمام افراد بری طرح چونک گئے تھے۔ وہ بے حد متوحش اور گھبرائی گھبرائی سی کمرے میں داخل ہوئی تھی۔

"ایس پی صاحب! مجھے' احمر کا فون نمبر چاہیے اور ایڈریس یا کوئی بھی ایسا نمبر جس پر میں ان سے کانٹیکٹ کر سکوں۔" اس کی آواز میں لرزش تھی اور لہجے و انداز سے بے قراری و بے تابی چھلک رہی تھی۔

"کون احمر؟" ایس پی فیضان حیران حیران سے اپنی جگہ سے اٹھ کھڑے ہوئے۔

"احمر' احمر ایاز جو ابھی گاڑی میں گئے ہیں یہاں سے۔"

ایس پی فیضان نے اس کی زرد ہوتی رنگت اور کپکپاتے وجود کو ایک نظر دیکھ کر آہستگی سے نفی میں سر ہلا دیا تھا۔

"وہ احمر ایاز نہیں تھا' کاشان تھا' آپ کو شاید کوئی غلط فہمی ہوئی ہے۔"

"واٹ؟" وہ حیرت و استعجاب سے انہیں دیکھے گئی۔

"یہ' یہ کس طرح ہو سکتا ہے میں نے اپنی آنکھوں سے انہیں دیکھا ہے میں بھلا میں انہیں پہچاننے میں کس طرح غلطی کر سکتی ہوں۔" اس کی آنکھوں میں بے یقینی تھی۔

"ہو سکتا ہے کسی مشابہت کی وجہ سے ایسا ہوا ہو۔ مگر بہر حال وہ احمر ایاز نہیں تھا۔" ایس پی صاحب کے قطعی انداز اور بے لچک لہجے پر وہ چیخ اٹھی تھی۔

"وہ احمر ایاز ہی تھے' دھوکا صرف ایک بار ہو سکتا ہے بار بار نہیں' آپ مجھ سے جھوٹ بول رہے ہیں ایس پی فیضان" اس کی آنکھیں چھلک جانے کو بے تاب تھیں۔

"آپ کو شاید اندازہ نہیں مگر میرا ان سے ملنا از حد ضروری ہے۔ پلیز' پلیز آپ مجھے ان کا ایڈریس بتا دیں میں خود ان سے مل لوں گی۔" وہ لجاجت سے کہہ رہی تھی۔

ایس پی فیضان الجھی الجھی نگاہوں سے کبھی اسے اور کبھی اپنے ساتھ بیٹھے ان دو آدمیوں کو دیکھ رہے تھے جن کے چہرے اس کے لیے قطعی اجنبی تھے۔

"دیکھیے محترمہ' ہم ایک بار پھر آپ سے یہی کہیں گے کہ۔"

"فار گاڈ سیک' مت جھٹلائیں مجھے اس طرح۔" وہ بے بسی کے انداز میں چلائی اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ کس طرح انہیں اپنی بات کا یقین دلائے۔

"آنکھیں دھوکا کھا سکتی ہیں مگر دل کی گواہی کبھی جھوٹی نہیں ہو سکتی میرا دل کہتا ہے کہ وہ احمر ہی ہے پھر آپ لوگ کیوں یقین نہیں کر رہے میرا' میں جھوٹ نہیں بول رہی ہوں بیلوی۔" مٹھیاں بھینچتے ہوئے وہ لاچار سے انداز میں انہیں یقین دلانا چاہ رہی تھی' مگر اپنی بات کا معمولی سا اثر بھی نہ ہوتے دیکھ کر وہ اور کچھ نہ کر سکی تو دونوں ہاتھوں میں منہ چھپا کر پھوٹ پھوٹ کر رو دی۔

اس کے انداز میں اتنی شدت تھی کہ سب لوگ گھڑی بھر کے لیے اپنی جگہ ساکت رہ گئے تھے۔ کمرے کی گمبھیر خاموشی میں اس کی ہچکیوں کی آواز دل کو پگھلائے دے رہی تھی۔

"میزاب! تم، تم کیسے جانتی ہو اسے؟" اچانک ہی اسے اپنے بہت قریب انتہائی مانوس سی آواز سنائی دی تو اس نے ایک جھٹکے سے سر اٹھایا۔ شدت گریہ سے اس کی آنکھیں لبورنگ ہو رہی تھیں وہ اس قدر ہیجانی کیفیت کا شکار تھی کہ آتے ہوئے یہ بھی نہ دیکھ سکی تھی کہ کمرے میں کون کون موجود ہے۔

"ارغان پلیز اپنے بھائی سے کہو کسی طرح اس شخص کو ڈھونڈ لائے بہت عرصے بعد امید کی کرن ہاتھ آئی ہے۔ اگر یہ روشنی کھو گئی تو میں ہمیشہ کے لیے اندھیروں میں ڈوب جاؤں گی۔ بہت انتظار کیا ہے، اس کا ایک ایک لمحہ صدی بن کر گزرا ہے بہت تلاشا ہے اسے اگر وہ کھو گیا تو میں یونہی خلا میں معلق رہوں گی نہ سر پہ آسمان ہو گا نہ پیروں تلے زمین۔" وہ ہذیانی انداز میں اس کا بازو ہلاتے ہوئے کہہ رہی تھی۔ آنسو ایک تواتر سے اس کے چہرے کو بھگوتے جا رہے تھے۔

"میزاب! تمہارا کیا تعلق ہے اس سے؟ کیسے جانتی ہو اسے؟" میزاب کا غیر معمولی ردعمل ارغان کو پریشان کر رہا تھا۔

"وہ، وہ شوہر ہے میرا نکاح ہو چکا ہے میرا۔ اس کے ساتھ۔" کرب آمیز بے بسی سے اس نے نڈھال ہوتے ہوئے بتایا تھا اور کتنے ہی بم چھوٹے تھے ارغان کی سماعتوں کے پاس، بہت بے اعتبار لگا تھا یہ لمحہ اسے۔ گہرا جامد سناٹا اس کے پورے وجود پہ چھاتا چلا گیا تھا۔

"ارغان!" چہرے کی مدھم ہوتی رنگت اور آنکھوں کی ماند پڑتی چمک ایس پی فیضان کی زیرک نگاہوں سے چھپی نہ رہ سکی تھی۔ سو بے اختیار ہی اس نے پکارا تھا۔

اور وہ جوان بے یقین ساعتوں کی ناہموار مسافت پہ تنہا حیران و پریشان کھڑا تھا۔ ایک دم چونکا اور پھر اپنی ناتمام خواہشوں اور بھرپور یاسیت کا بوجھ اٹھائے کمرے سے باہر نکلتا چلا گیا۔ صورت حال اگرچہ غیر متوقع تھی مگر فیضان کو اپنے ساتھ موجود سرکاری افسران کے خیال سے فوری طور پر سنبھالنا پڑا تھا۔

"میزاب!" وہ میز کے پیچھے سے گھوم کر اس کے قریب چلے آئے۔ جو سارے آنسو شاید آج ہی بہا دینا چاہتی تھی۔

"کاشان لاہور کے لیے روانہ ہو چکا ہے۔ کچھ دیر بعد ہم بھی وہیں جا رہے ہیں۔ میں خود اس سے ملوں گا اور ہو سکتا ہے واپسی پر اسے اپنے ساتھ یہیں لیتا آؤں۔ تم خود اس سے مل کر تسلی کر لینا فی الحال رونا بند کرو اور چلو میں تمہیں گھر چھوڑ آتا ہوں۔" ایس پی فیضان کا لہجہ حد سے زیادہ نرمی لیے ہوئے تھا۔

"سر! میں، میں آپ کا یہ احسان زندگی بھر نہیں بھولوں گی پلیز بس ایک بار مجھے ان سے ملوا دیں۔" آنکھوں سے بہتے آنسوؤں کو سختی سے رگڑتے ہوئے اس نے نم لہجے میں التجا کی تھی جواباً ایس پی فیضان نے اثبات میں سر ہلا کر ہولے سے اس کے سر پر ہاتھ رکھتے ہوئے گویا تسلی دی اور اسے ساتھ لے کر باہر نکل گئے۔

♥ ♡ ♡ ♥

بعض لوگوں کی زندگی میں خوشیوں کا حصہ بہت کم ہوتا ہے اور اسے لگتا تھا زندگی میں اس کی خوشیوں کا حصہ اختتام پذیر ہو چکا ہے اور اب باقی ماندہ زندگی میں نہ وہ کبھی خوش ہو سکے گی نہ مسکرا سکے گی اور نہ زندگی کی خوب صورتیوں سے لطف کشید کر سکے گی۔ مگر یہ سب تو اس نے آج سوچا تھا۔ بیتے ہوئے کل میں اس کی رائے کچھ اور تھی۔ تب وہ برملا کہا کرتی تھی۔

"دنیا میں شاید ہی کوئی فرد اتنا خوش قسمت ہو جتنی کہ میں یعنی میزاب سکندر۔" اسے یاد آیا وہ ان دنوں بات بے بات ہنسا کرتی تھی۔ ایک شوخ و چنچل مسکراہٹ ہمہ وقت اس کے چہرے پر رقصاں رہتی اور پاپا کہا کرتے۔

"یہ مسکراہٹ تو ہے ہی ہماری بیٹی کے لبوں پہ سجنے کے لیے۔"

اور ماما جب کبھی اسے کسی بات پر بے تحاشا ہنستے ہنستے بے حال ہوتے دیکھتیں تو فوراً ٹوک دیتیں۔

"اتنا مت ہنسا کرو میزاب! مجھے ڈر لگنے لگتا ہے۔"

”کیوں ماما! ہنستے ہوئے میری شکل بہت ڈراؤنی ہو جاتی ہے کیا؟“ وہ بمشکل اپنی ہنسی ضبط کر کے پوچھتی تو ماما اس کی سیاہ آنکھوں کی چمک دیکھ کر دل ہی دل میں اس کی نظر اتارنے لگتیں کہ ان کے آنگن میں اسی ایک پھول کی وجہ سے بہار قائم و دائم تھی۔

زندگی اسی تسلسل سے جاری و ساری تھی جب پاپا کے بڑے بھائی ایاز ہارٹ فیل ہو جانے سے اس دار فانی سے رخصت ہو گئے۔ تائی امی تو کئی سال پہلے ہی انہیں چھوڑ کر جا چکی تھیں۔ پاپا تایا ابو کی رسومات میں شرکت کے بعد واپس آئے تو تایا ابا کا اکلوتا لخت جگر ان کے ساتھ تھا۔

احمر ایاز کی بڑی بڑی آنکھوں میں ٹھہری خاموشی اور اداسی زود رنج اور حساس ہونے کی گواہ تھی‘ وہ اپنے آپ میں گم رہنے والا‘ خاموش طبع لڑکا تھا سو میزاب اپنی عادت کے برعکس اس سے بے تکلف نہیں ہو سکی تھی ایک جھجک ایک تکلف شروع دن سے ان دونوں کے درمیان حائل ہو گیا تھا۔

احمر کو یہاں رہتے ہوئے دو سال ہو گئے تھے۔ تب ہی میزاب کو معلوم ہوا کہ پاپا احمر کو ہائر اسٹڈیز کے لیے بیرون ملک بھجوانا چاہتے تھے۔ میزاب کے لیے یہ بات غیر معمولی نہیں تھی کہ وہ باہر جا رہا ہے بلکہ حیران کن بات یہ تھی کہ پاپا اس کے اور احمر کے نکاح کے بعد احمر کو بھجوانا چاہ رہے تھے اور اسی سلسلے میں جب ماما نے اس کی رائے لی تو چپ چاپ گم صم سے انداز میں انہیں دیکھتی رہ گئی۔ اس نے تو ان دونوں میٹرک کے سبجیکٹ بھی ماما کے مشورے پر سلیکٹ کیے تھے۔ کجا کہ زندگی کا اتنا بڑا معاملہ اور وہ بھی اس قدر اچانک وہ اپنی جگہ جز بز سی ہو کر رہ گئی۔ اس نے دبے دبے لفظوں میں ماما کو احساس دلانا چاہا کہ وہ یہ سب قبل از وقت ہے۔ مگر ماما نے بڑے بھاؤ سے اس کے جواز کو رد کر دیا تھا۔

”جانو! ابھی تو صرف نکاح ہو گا‘ رخصتی کے بارے میں تو اس وقت سوچیں گے جب تم دونوں اپنی تعلیم مکمل کر لو گے اور تم جانتی ہو کہ اس میں کئی سال لگ جائیں گے۔ بس یوں سمجھ لو کہ تمہارے پاپا احمر کے پاؤں میں زنجیر ڈالنا چاہتے ہیں تاکہ وہ جوں کا توں واپس آ سکے تم بس مجھے اتنا بتا دو کہ تمہیں احمر کیسا لگتا ہے۔“ ماما نے اپنی ریشمی ساڑھی کے سرسراتے پلو کو شانے پہ جماتے ہوئے پوچھا تو وہ ان کی طرف سے رخ موڑ کر کھڑکی سے باہر جھانکنے لگی۔

دو سال کے عرصے میں اگرچہ ان دونوں کی فرینڈ شپ نہیں ہو سکی تھی مگر پھر بھی احمر ایاز ایسا نہیں تھا کہ اسے ناپسند کیا جا سکے۔ وہ اس سے زیادہ بات نہیں کرتا تھا بلکہ اس سے کیا کسی سے بھی بے تکلفانہ بات چیت نہیں کرتا تھا زیادہ ہی موڈ میں ہوتا تو میتھس کے مشکل اور بڑے بڑے سوال اسے حل کر دیا کرتا تھا۔

کبھی اپنے حصے کی چاکلیٹ بڑے آرام سے اسے دے دیتا۔

یا پھر اسے ماما‘ پاپا کے ساتھ شرارتیں کرتے دیکھ کر ہولے ہولے مسکراتا رہتا۔

”میزاب! چندا تم نے بتایا نہیں۔“ ماما کے دوبارہ پوچھنے پر ان کی طرف پلٹی تو کچھ کہنے کے بجائے وہ بس کندھے اچکا کر مسکرا دی تھی اور یوں احمر ایاز کے جرمنی جانے سے چند روز قبل ایک رنگا رنگ تقریب میں ان کا نکاح کر دیا گیا تھا۔

”کیوں بھئی‘ احمر کے بھاگ جانے کا اندیشہ تھا جو اتنی جلدی کر ڈالی۔“ وہ شرمائی‘ شرمائی سی بیٹھی تھی جب ایک دوست نے اس کے کان میں سرگوشی کی۔

”اب تو محترمہ کر چکیں میٹرک نہ صاحب کے خیالوں سے فرصت ملے گی اور نہ کتابوں پر لکھے حرف نظر آئیں گے“ پڑوس میں رہنے والی نادیہ نے مذاق نہیں طنز کیا تھا۔ وہ بس اس کی شکل دیکھتی رہ گئی۔

ان دنوں میٹرک کے ایگزام ہونے والے تھے۔ اس نے دل ہی دل میں مصمم ارادہ کر لیا تھا کہ اپنی سابقہ پوزیشن بحال رکھے گی۔ احمر کے روانہ ہونے میں ابھی کچھ دن باقی تھے مگر ان دنوں میں بھی احمر کے رویے نے یہ ثابت نہیں ہونے دیا تھا کہ ان دونوں

کے درمیان رشتے کی نوعیت بدل چکی ہے بلکہ وہ پہلے سے بھی زیادہ محتاط ہو گیا تھا۔

یہ بات میزاب کے لیے باعث اطمینان تھی سو وہ بھی اطمینان سے اپنی پڑھائی میں مصروف ہو گئی اور پھر ایک روز احمر جرمنی کے لیے روانہ ہو گیا۔ وہ میٹرک سے ایف ایس سی میں آ گئی احمر کا ہر ماہ فون آتا مگر میزاب سے ایک بار بھی بات نہیں ہوئی بس ماما سے اس کی خیر' خیریت کا علم ہوتا رہتا۔ اگرچہ ماما' پاپا کی طرف سے کوئی پابندی نہ تھی مگر اس کے باوجود نہ کبھی احمر نے اس سے بات کرنے کی خواہش کا اظہار کیا تھا اور نہ میزاب نے اور اس میں زیادہ حصہ شاید احمر کی سنجیدہ طبیعت کا بھی تھا۔

دو سال بعد احمر نے پاپا کے بے حد اصرار پر اپنی تازہ ترین تصویریں بھیجیں تو سب کے ساتھ ساتھ وہ بھی حیران رہ گئی۔ ان دو سالوں میں وہ کس حد تک بدل گیا تھا۔ دبلا پتلا سا احمر اب اونچے لمبے وجیہہ سراپے والا احمر بن چکا تھا۔

"ماما! یہ تو بالکل ہی بدل گیا ہے۔" اس نے جی بھر کے حیرت کا اظہار کیا تو ماما اس کی طرف دیکھ کر مسکرا دیں۔

"تم بھی تو ویسی نہیں رہیں بدل گئی ہو پہلے سے 'کیا خیال ہے احمر کو تمہاری چند تصویریں بھیجیں۔" ماما نے بالکل دوستانہ انداز میں شرارت سے پوچھا تو وہ بری طرح جھینپ گئی۔

"ہرگز نہیں ماما! جب وہ خود سے کہے گا' تب بھیج دیں گے۔" اس نے ماما کو ٹالا تھا۔ پھر نہ احمر نے فرمائش کی اور نہ انہوں نے تصویریں بھجوائیں۔ تب ہی اس کا ایف ایس سی کا رزلٹ آؤٹ ہوا۔ شاندار پوزیشن لینے پر پاپا نے ایک اچھی سی پارٹی کا اہتمام کیا تھا۔ وہ تتلی بن کر پورے گھر میں اڑتی پھر رہی تھی جب اچانک پاپا نے اسے اپنے پاس بلایا۔

"بھئی ان سے ملو یہ وہاب حسن ہیں۔" انہوں نے اپنے ساتھ کھڑے ایک پروقار سے شخص سے اس کا تعارف کروایا۔

"ہیلو انکل۔" وہ بشاشت سے مسکرائی تھی۔ جواباً انہوں نے مسکراتے ہوئے ایک گفٹ اس کی طرف بڑھایا تو وہ "تھینک یو" کہتی ہوئی آگے بڑھ گئی۔ اس نے وہاب حسن کو پاپا کے عام دوست کی نظر سے دیکھا تھا مگر آنے والے دنوں میں اسے یہ احساس ہوا کہ وہ شخص پاپا کے لیے بے حد اہمیت اختیار کرتا جا رہا ہے۔ حتیٰ کہ پاپا جو ہمیشہ سے تنہا اپنا بزنس چلاتے آ رہے تھے' اپنے زور بازو پر آگے بڑھ رہے تھے' وہاب حسن کو اپنا بزنس پارٹنر بنانے پر رضامند ہو گئے تھے۔

اور اب اسے خیال آ رہا تھا کہ وہاب حسن نے پاپا کے بزنس میں شراکت نہیں کی تھی' بلکہ بدنصیبی دربدری' حرماں نصیبی اس کی زندگی کی حصہ دار بن گئی تھی۔

وہ موسم بہار کی اولین صبح تھی۔

نوخیز' ترو تازہ' شگفتہ آسمان کی فیروزے جیسی چمک دیکھنے والی آنکھ میں بھی نیلاہٹیں سی بھر دیتی تھی۔

چند روز پہلے کے زرد' ٹنڈ منڈ درخت زمردیں ہریالی کا پیراہن اوڑھے فضاؤں میں جھوم رہے تھے۔ خاک بسر زمین پر سبزے کی چادر سفید شبنمی موتیوں سے سجی ہوئی تھی۔ کیاریوں میں سرخ گلاب' موتیا اور بیلے کی کلیاں پورے جوبن پر تھیں۔

صبح کی گنگناتی ہوا جھولیاں بھر بھر خوشبو لٹا رہی تھی۔

تتلیاں بصورت قاصد ایک پھول سے دوسرے پھول تک کا سفر کرتے ہوئے اپنے پر بہار پروں سے نازک پتیوں کو چھوتیں تو فضا میں نغمگی کچھ اور بڑھ جاتی۔

ایسے میں وہ کمرے سے باہر آئی تو پتوں کی تال پہ گنگناتے پرندوں اور سرخ' سبز' پیلے' اودے رنگوں کا طلسم لمحہ بھر میں اس پر چھاتا چلا گیا۔

دل میں اسی ماحول کا حصہ بننے کی خواہش شدت سے ابھری تو وہ ننگے پاؤں لان میں چلی آئی اور پھر مالی کے ہاتھ سے پانی کا پائپ لے کر پودوں کو پانی دینے لگی اور اس کام میں اس طرح منہمک ہوئی کہ جب اچانک

کسی نے اسے پیچھے سے آواز دی تو وہ بری طرح خوفزدہ ہو کر اچھلی اور اسی بوکھلاہٹ میں جب وہ سیدھی ہوئی تو پانی کی موٹی سی دھار سامنے کھڑے وہاب حسن کو سر تاپا پانی سے بھگو گئی تھی۔ اس نے پہلے گھبرا کر پائپ نیچے پھینکا اور پھر آنکھیں جھپک جھپک کر انہیں دیکھے گئی۔ ان کا خیال تھا کہ وہ شرمندگی کا اظہار کرتے ہوئے فوراً ہی معذرت کرے گی لیکن اسے نجانے کیا ہوا کہ نک سک سے تیار وہاب حسن کی یہ درگت دیکھ کر اپنی ہنسی ضبط نہ کر سکی اور کھلکھلا کر ہنستی چلی گئی۔ وہاب حسن نے بالوں سے پانی جھٹکتے ہوئے اس کی طرف دیکھا تو پھر دیکھتے ہی چلے گئے۔

ڈارک گرین سوٹ پر سرخ اور سبز چنری کا دوپٹہ اوڑھے وہ نوخیز بہار میں اضافے کا سبب لگ رہی تھی وہاب حسن کو لگا وہ آج پہلی مرتبہ میزاب سکندر کو دیکھ رہے ہیں۔ وہ پہلے تو کبھی ایسی نہ دکھائی دی تھی۔

سنہری دھوپ کی طرح دمکتی رنگت
بہار کے سب رنگوں سے آراستہ نوخیز وجود
موج صبا کی طرح سبک خرام
کلیوں کی سی نزاکت
صبح کی اولین کرنوں کی طرح پرنور
اور قطرہ آب کی طرح مصفا

وہاب حسن دم بخود سے ٹکٹکی باندھے اسے دیکھتے ہوئے گویا خود کو بھول گئے تھے۔

"آیئے انکل! میں آپ کو پاپا کا کوئی سوٹ دیتی ہوں۔" وہ کہتی ہوئی کمرے کی طرف بھاگ گئی۔ وہاب حسن کی نظروں نے اس کا بہت دور تک تعاقب کیا تھا اور یہ ہی وہ لمحہ تھا جب وہ آخری بار مسکرائی تھی۔ اس کے بعد زندگی اپنے چہرے سے نقاب ہٹاتی چلی گئی تھی۔

اس واقعے کے چند بعد ہی اس نے دیکھا پاپا بے حد پریشان رہنے لگے تھے۔ اس نے ماما سے پوچھا تو وہ لاعلمی کا اظہار کر کے رہ گئیں۔ تب ایک شام اس نے سوچا کہ آج وہ پاپا سے ان کی پریشانی کی وجہ اگلوا کر ہی دم لے گی۔ مگر اتفاقاً ہی اسے ماما کے ساتھ ان کی کسی دوست کی طرف جانا پڑ گیا۔ شام ڈھلے جب وہ واپس آئیں تو گیٹ کھلا تھا اور چوکیدار غائب تھا۔ گھر پہ چھائی غیر معمولی خاموشی نے ان دونوں کو چونکا کر رکھ دیا تھا۔ ماما اس سے پہلے بیڈ روم تک پہنچی تھیں۔ وہ ملازمہ کی تلاش میں کچن کی طرف بڑھی ہی تھی جب ماما کی تیز چیخ پورے گھر میں گونج کر رہ گئی۔

وہ برق رفتاری سے سیڑھیاں چڑھتی اوپر پہنچی جہاں بیڈ روم کے کھلے دروازے میں ماما خطرناک حد تک سفید ہوتے چہرے کے ساتھ کانپ رہی تھیں اس سے پہلے کہ وہ استفسار کرتی ماما پلٹ کر چیختی چلاتی باہر کی طرف بھاگی تھیں۔ اس نے ناسمجھی کے عالم میں بیڈ روم کے اندر جھانکا تو ہفت آسمان اس کی نگاہوں کے سامنے گھوم گئے۔ کمرے کے عین وسط میں پاپا گرے ہوئے تھے۔ ان کی کٹی ہوئی شہ رگ سے خون ابل ابل کر قالین میں جذب ہو چکا تھا۔ اس کا سانس کہیں سینے میں اٹک کر رہ گیا تھا۔ وہ برف کے مجسمے کی طرح ساکت تھی۔

پاپا کی ادھ کھلی آنکھیں اس کے قدموں پر جمی تھیں اور وہ جو بھاگ جانا چاہتی تھی اپنی جگہ سے ایک انچ بھی نہ سرک سکی۔ تب ہی بھاگتے دوڑتے قدموں کی آوازیں اس کے قریب آئی تھیں۔ کسی نے اسے دونوں بازوؤں سے پکڑ کر اپنی طرف گھسیٹ لیا تھا۔ بیڈ روم کا دروازہ بند کر دیا گیا تھا۔ وہ نجانے کب تک کھلی، ساکت آنکھوں میں روتے پیٹتے لوگوں کو دیکھتی رہی اور پھر دنیا ومافیہا سے بے خبر ہو گئی۔ جب اسے ہوش آیا تب معلوم ہوا کہ قیامت آ کر گزر چکی ہے۔ ایسے کڑے وقت میں اسے سب سے پہلا خیال احمر کا آیا تھا۔ ماما ان دنوں عدت میں تھیں سو اس نے وہاب انکل سے احمر کے متعلق پوچھا جو ان دنوں پاپا کے ایک سچے اور کھرے دوست کی حیثیت سے ان کی ڈھارس بندھا رہے تھے۔

"بہت دفعہ فون کیا ہے میں نے، ای میل بھی

چھوڑا ہے اس کے لیے۔ مگر رابطہ ہی نہیں ہو رہا۔" وہ خود بھی پریشان ہو رہے تھے۔ لیکن اسی شام جب ماما نے فون کیا تو دوسری بیل پر ہی فون اٹھا لیا گیا یہ احمر ہی تھا۔ پاپا کے قتل کی خبر سن کر وہ شاک رہ گیا اور جب اس نے آنے کے بارے میں کہا تو ماما نے اسے روک دیا۔

"نہیں احمر! جو ہونا تھا وہ ہو چکا پولیس تحقیقات کر رہی ہے۔ تمہارے امتحانات نزدیک ہیں' اس کے بعد چلے آنا ویسے بھی یہاں سکندر کے دوست وہاب حسن ہیں' اس مشکل وقت میں وہ ہمارا بہت ساتھ دے رہے ہیں۔"

ماما کے کہنے پر احمر بس خاموش ہو گیا تھا۔ لیکن یہ تو بعد میں معلوم ہوا کہ بظاہر اس قدر ہمدرد نظر آنے والا اندر سے کس قدر خبیث اور شاطر انسان ہے۔ اس شام وہ لان کے پچھلے حصے سے اٹھ کر کمرے کی طرف آ رہی تھی جب کمرے سے آتی وہاب حسن اور ماما کی آواز نے اسے چونکا دیا۔

"شرم کرو وہاب حسن! وہ تمہاری بیٹی کے برابر ہے۔" ماما کی آواز غم و غصے سے کانپ رہی تھی۔

"بیٹیوں جیسی ہے' بیٹی تو نہیں نا۔" ان کے سیاہی مائل ہونٹوں پہ مکروہ مسکراہٹ کھیل رہی تھی۔

"تم' تم اس قدر پنچ' گھٹیا اور پست ذہنیت رکھتے ہو وہاب حسن! میں نے کبھی سوچا بھی نہیں تھا لیکن میزاب احمر کی امانت ہے۔ میں تمہیں اس کی طرف آنکھ اٹھا کر بھی نہیں دیکھنے دوں گی۔" ماما تنفر سے چلائی تھیں۔

"ہا' ہا سکندر نے بھی یہ کہا تھا۔ اسی لیے اپنے ہی گھر کے اپنے ہی بیڈ روم میں مارا گیا بے چارہ اور رہا احمر تو وہ اتنا خوش قسمت کبھی بھی نہیں ہو سکتا۔" وہاب حسن کا قہقہہ ان کے جارحانہ عزائم کا پتا دے رہا تھا۔

"اور ایک بات میں بھی تمہیں بتا دوں کوئی چالاکی دکھانے کی کوشش مت کرنا' آج رات میرے آدمی اس گھر کے باہر پہرہ دیں گے' کسی سے مدد لینے یا پناہ لینے کی کوشش کی تو تمہارا بھی وہی حشر ہو گا جو تمہارے شوہر کا ہوا اور تو اور ان لوگوں کے بھی پرخچے اڑا دوں گا جنہوں نے تم لوگوں کو آسرا دینے کی غلطی کی۔" ان کا حد درجہ سرد و سپاٹ لہجہ اس کی ریڑھ کی ہڈی میں سنسناہٹیں سی دوڑا گیا تھا۔ وہ سائیں سائیں کرتے دماغ کے ساتھ دیوار کا سہارا لینے پر مجبور ہو گئی تھی۔ وہاب حسن کمرے سے باہر نکلے تو اسے دیکھ کر ایک لحظے کے لیے ٹھٹھک گئے۔

"بس ایک رات کی دوری ہے میرے اور تمہارے بیچ اس کے بعد۔" ایک مکروہ مسکراہٹ سے اس کے چہرے پہ جھولتی لٹ کو پیچھے ہٹانا چاہا مگر ماما نے اسے بازو سے پکڑ کر اپنے پیچھے چھپا لیا تھا وہ جیسے ان دونوں کی بے بسی اور بے چارگی سے لطف اٹھاتے چلے گئے تھے اور وہ اتنی خوفزدہ ہو چکی تھی کہ اس کے بعد جو کچھ ماما نے کیا وہ اس پر کوئی سوال بھی نہ کر سکی تھی۔

اسی رات ماما نے اپنے تمام زیورات' نقدی اور کچھ پرائز بانڈز ایک چھوٹے سے بیگ میں ڈالے تھے اور پھر ساتھ والی کوٹھی کی چھت کے ذریعے وہ دونوں وہاں سے بھاگ نکلنے میں کامیاب ہو سکیں وہاب حسن کی نظروں سے اوجھل رہنے کے لیے ماما نے ٹرین کا سفر مناسب سمجھا وہ جلد از جلد اس جگہ سے دور پہنچ جانا چاہتی تھیں جہاں ایک درندہ ان کی معصوم بیٹی کو نگلنے کے لیے بے تاب ہو رہا تھا۔ ساری رات سفر میں گزری صبح ہونے پر گاڑی کسی اسٹیشن پر رکی تو ماما اسے ساتھ لے کر نیچے اتر آئیں۔ اسے ایک بینچ پر بٹھا کر ماما اسے وہاں سے نہ ہلنے کی تاکید کرتے ہوئے ناشتے کا انتظام کرنے چل دیں۔ وہ گھبرائی گھبرائی سی ادھر ادھر دیکھنے لگی۔ تب ہی اس کی نظر سامنے کھڑے شخص پر جا پڑی جو اسے بری طرح گھور رہا تھا اور وہ اس طرح خوفزدہ ہو کر ماما کی طرف بھاگی کہ زیورات والا بیگ وہیں بینچ پر چھوڑ آئی اس آدمی کا سن کر ماما اور بھی وحشت زدہ سی ہو گئیں۔

"کہیں وہاب حسن کا آدمی نہ ہو۔" وہ اس کا ہاتھ پکڑے اس جگہ سے کافی دور چلی گئیں۔ تب اسے احساس ہوا کہ وہ خالی ہاتھ ہے۔ ماما کو علم ہوا تو وہ دھک

سے رہ گئیں۔ اسی مقام پر آ کے ان کی تمام ہمتیں اور حوصلے ان کا ساتھ چھوڑ گئے۔ انہوں نے لڑکھڑا کر دیوار کا سہارا لیا تو پھر بیٹھتی چلی گئیں۔

"ماما! کیا ہوا ہے آپ کو؟ پلیز آنکھیں کھولیں۔" وہ متوحش انداز میں انہیں جھوڑنے لگی۔

"کیا بات ہے بیٹی؟" نرم سی آواز کہیں قریب ہی ابھری تھی۔ اس نے ایک جھٹکے سے سر اٹھایا۔ ایک ادھیڑ عمر خاتون چہرے پہ مہربان مسکراہٹ لیے اس پر جھکی ہوئی تھیں۔

یہ خاتون فردوس خالہ تھیں جو اسے اور ماما کو اپنے ساتھ لے آئیں۔ کچھ دن سنبھلنے میں لگے تھے اس کے بعد ماما نے جرمنی فون کر کے احمر کو صورت حال سے آگاہ کرنا چاہا تو معلوم ہوا کہ وہ چار روز قبل پاکستان کے لیے روانہ ہو گیا تھا یہ وہی دن تھا جب ان لوگوں نے اپنا گھر چھوڑا تھا اور اس کے بعد ماما نے فون کے ذریعے گھر کے آس پڑوس میں رہنے والے لوگوں سے احمر کے متعلق معلوم کرنا چاہا مگر کوئی بھی اس کی آمد سے باخبر نہیں تھا اور تب سے اب تک وہ ہزاروں چہروں میں اس ایک چہرے کو کھوجتی آئی تھی اور جب یہ چہرہ نظر آیا تھا تو کہنے والوں کا اصرار تھا کہ وہ کاشان ہے احمر نہیں۔

دن اپنی تمام تر تھکی ماندی مسافت کو سمیٹے رات کی آغوش میں جا چھپا تھا۔

شاہ خاور اپنی نیم خوابیدہ کرنوں کو لیے افق کے اس پار جا اترا تھا۔

آسمان کے سیاہ سینے پر کندہ پورا چاند ہر روز سے کچھ زیادہ ہی زرد تھا اور اس کی تنہائی رات کی سلگتی دہلیز پر بیٹھی اپنے راکھ راکھ بدن میں شرر زیست کو تلاش رہی تھی۔

ابھی کچھ دیر قبل ماما اس کے پاس سے اٹھ کر گئی تھیں، کتنے اصرار سے انہوں نے پوچھا تھا۔

"میزاب! تمہیں کیا ہوا ہے؟"

جواباً" اس نے بمشکل مسکراتے ہوئے انہیں ٹالنا چاہا تو وہ نفی میں سر ہلا کر رہ گئیں۔

"ایسے مت مسکراؤ میزاب! تمہاری مسکراہٹ تمہارے آنسوؤں سے زیادہ غم آلود ہے۔" اور پھر رات کے سناٹے میں ان کے جاتے قدموں کی آواز سنائی دی تھی اور اس کے بعد پھر ایک لامحدود چپ تھی اور وہ۔

کئی روز ہو گئے تھے اسے خود سے جدا ہوئے صبح گھر سے نکلتی اور شام تک دیوانوں کی سی حالت میں اس راہ گزر پر نظریں گاڑے کھڑی رہتی جہاں اسے احمر کے آنے کا یقین تھا۔

اور جب بھی سرسراتی ہوائیں پتوں سے ٹکرا کر کسی آہٹ کا گمان پیدا کرتیں تو وہ چونک چونک جاتی۔

اس یقین سے نگاہ اٹھاتی کہ سامنے احمر ایاز کھڑا ہو گا مگر پل بھر میں اس کے سامنے ایک لمبا چوڑا وجود ایستادہ ہو جاتا جو اپنی آنکھوں میں بے تحاشا چمک لیے اس کی طرف جھکتا اور پوچھتا۔

"سنو تم نے کبھی محبت کی ہے۔" وہ گھبرا کر رخ موڑ لیتی مگر اس کی جاندار آواز سماعتوں کے ریگزار میں گونجتی رہ جاتی۔

"میں نے محبت کی ہے بے تحاشا محبت، عشق کی سرحدوں کو چھوتی ہوئی محبت

اپنے جذبوں کی عمیق گہرائیوں اور دل و جان کی تمام تر سچائیوں کے ساتھ چاہا ہے جانتی ہو کسے؟"

اور یہیں پہ آ کے احمر ایاز بڑی استقامت کے ساتھ ان دونوں کے بیچ حائل ہو جاتا مگر وہ خاموش لب اور بولتی آنکھیں پس منظر میں جھانکتی رہتیں۔

"یہ کس عذاب میں پھنس گئی ہوں میں۔" وہ دوہرے کرب کا شکار تھی اپنا آپ خود سے جدا ہوتا محسوس ہو رہا تھا۔

"اور اگر وہ احمر نہ ہوا واقعی کاشان ہوا پھر؟" ڈھیروں واہمے اور خدشے اس کے یقین کے گرد گھیرا تنگ کرنے لگے تو وہ بے قرار سی ہو کر پورے صحن میں چکرانے لگی۔

"نہیں، وہ احمر ہی تھا۔" بند آنکھوں نے ایک مرتبہ پھر اس کے نقوش ازبر کیے۔

"چلو مان لیا' وہ احمر ہی تھا پھر؟" دل کسی بچے کی طرح آنے والے لمحات سے خوفزدہ تھا۔

"پھر؟" اس کے قدموں تلے گردش کرتی زمین تھم گئی تھی۔

"میں نے محبت کی ہے' بے تحاشا محبت' عشق کی سرحدوں کو چھوتی ہوئی جانتی ہو' کس سے۔" کوئی اس کے کان میں آکر چیخا تو وہ خوفزدہ ہو کر بری طرح چلا اٹھی۔

"خاموش ہو جاؤ' کچھ مت کہو' نہیں بہکاؤ مجھے بار بار۔" وہ سسکتے ہوئے دیوار سے جا لگی تھی۔

نیم تاریک کمرے کی دہلیز پہ کھڑی ماما نے اس کے گالوں پہ چمکتے آنسوؤں کو دیکھا ضرور مگر آگے بڑھ کر انہیں سمیٹ لینے کی ہمت نہ کر سکیں۔

"کیوں ہو رہا ہے ایسا؟ ذہنی کشمکش اسے نڈھال کر چکی تھی۔

"کیوں میرے دل میں اس شخص کی محبت جگہ نہ پا سکی' جس کا نام میرے نام کے ساتھ لکھ دیا گیا کیوں یہ دھڑکنیں اس دل کے تابع نہ ہو سکیں جو میرا نصیب ہے؟

کوئی دوسرا میری ذات کا سفر کیوں طے کرتا چلا گیا؟ میرے خواب' میری تمنائیں کسی اجنبی کی خواہش سے ہم آہنگ کیسے ہو گئیں؟" وہ بلک بلک کر پھوٹ پھوٹ کر رو رہی تھی ماما اس کے خاموش' لرزتے وجود کو دیکھ کر ساکت ہو چکی تھیں۔

تب ہی دروازے پہ ہونے والی تیز دستک نے ان دونوں کو چونکا دیا۔

"اس وقت کون ہو سکتا ہے۔" نظروں کے تصادم پہ دونوں کے دل میں ایک ہی سوال ابھرا تھا۔

"کون؟" دروازے کی کنڈی پر ہاتھ رکھتے ہوئے ماما نے دھیرے سے پوچھا تھا۔

"میں ہوں احمر ایاز۔" کوئی باہر سے پکارا تھا۔

مانوس لب و لہجہ' جانی پہچانی آواز۔

"کنڈی "ٹھک" سے ماما کے ہاتھوں سے پھسل گئی تھی۔ قدموں کی لڑکھڑاہٹ نے بے اختیار ہی انہیں دروازے کا پٹ تھام لینے پر مجبور کر دیا تھا۔

میزاب کی سسکیاں دم توڑ گئیں۔

اس کا وہم حقیقت کے قالب میں ڈھل کر سامنے آکھڑا ہوا تھا۔

وہ اور ماما جس معجزے کی منتظر تھیں وہ ظہور پذیر ہو چکا تھا۔

"احمر۔" ماما کی ہونٹوں سے "احمر" اور آنکھ سے آنسو ایک ساتھ نکلے تھے۔ وہ دیوانہ وار احمر کی طرف بڑھیں۔ اور میزاب ستون کی اوٹ میں بیٹھتی چلی گئی تھی۔

♥ ♡ ♡ ♥

"جب آپ نے جرمنی میں بذریعہ فون مجھے انکل سکندر کے انتقال کے بارے میں بتایا تو مجھے بے حد شاک پہنچا۔ اگرچہ آپ نے مجھے پاکستان آنے سے منع کر دیا تھا مگر مجھے آپ کی کیفیت کا پوری طرح اندازہ تھا۔ میں سوچ سکتا تھا کہ اس وقت آپ کو میری کتنی ضرورت ہو گی۔ سو میں نے پہلی فلائیٹ سے ہی پاکستان آنے کا محکم ارادہ کر لیا اور جب میں نے آپ کو فون پر اطلاع دینی چاہی تو یہ فون وہاب حسن نے اٹینڈ کیا۔ چونکہ آپ اچھے الفاظ میں اس کا ذکر کر چکی تھیں۔ اس لیے میں نے اسے اپنی آمد کی اطلاع دے دی اور یہی میری سب سے بڑی غلطی تھی۔ ایرپورٹ سے ٹیکسی پر گھر آتے ہوئے مجھ پر گولیوں کی بارش کر دی گئی۔ ڈرائیور کے زخمی ہونے پر گاڑی اپنا توازن کھو بیٹھی اور سڑک کے ساتھ کھائیوں میں گرتی چلی گئی۔ میری خوش قسمتی کہ بے شمار گولیوں کا نشانہ بننے کے بعد میں عالم مدہوشی میں گاڑی کے کھلے دروازے سے باہر لڑھک گیا۔ یہ جگہ آبادی سے دور تھی اس پر رات کا وقت سو ان لوگوں نے تمام کارروائی بہت اطمینان کے ساتھ انجام دی۔ حملے کے بعد انہوں نے ٹیکسی کا مکمل جائزہ لیا۔ انتہائی مسخ شدہ حالت میں ایک لاش ڈرائیونگ سیٹ پر تھی اور دوسری لاش عقبی سیٹ پر۔ سو انہوں نے اطمینان کر لینے کے بعد گاڑی کو آگ لگا دی تاکہ کسی قسم کا ثبوت باقی نہ رہے یہ اور بات کہ

خدا کو میری زندگی منظور تھی۔ گاڑی میں دوسری موجود لاش اس شخص کی تھی جو پچھلے موڑ پر ٹیکسی میں سوار ہوا تھا۔ اسی دوران ایس پی فیضان کی گاڑی وہاں سے گزری۔ جائے وقوعہ کا جائزہ لیتے ہوئے انہیں اندھیرے میں میری گھڑی کا چمکتا ہوا ڈائل نظر آ گیا تھا۔ میری سانس رک رک کر چل رہی تھی سو انہوں نے ایک سیکنڈ کی بھی دیر نہ کی اور مجھے اپنے ایک دوست ڈاکٹر کے ہاسپٹل میں لے گئے جہاں میری موجودگی کو مکمل راز رکھا گیا تاکہ میرے دشمن مجھ پر دوبارہ حملہ آور نہ ہو سکیں۔ ایس پی فیضان شدت سے اس بات کے منتظر تھے کہ میں ہوش میں آؤں اور انہیں اپنے متعلق کچھ بتا سکوں مگر جب ایک ہفتے بعد مجھے ہوش آیا تو میرا ذہن ایک صاف سلیٹ کی مانند تھا۔

میں کون ہوں؟
کہاں سے آیا ہوں؟
کیا کرتا ہوں؟

مجھے کچھ یاد نہیں تھا۔ اس حادثے میں سر پر چوٹ لگنے کے باعث بعد میں اپنی یادداشت کھو چکا تھا۔ کئی ماہ زیر علاج رہنے کے بعد میں ایس پی فیضان کے ساتھ ہی رہنے لگا تھا۔ فیضان کو اپنے کام سے جنون کی حد تک لگاؤ ہے۔ وہ ایک سچا اور کھرا پولیس آفیسر ہے اس نے مجھے بتایا کہ وہ ان دنوں ایک بہت بڑے گروہ کے پیچھے لگا ہوا ہے مگر ابھی تک کوئی ثبوت اس کے ہاتھ نہیں لگ سکا۔ اس سلسلے میں اس نے مجھ سے مدد کی درخواست کی تھی۔ بہت سوچ بچار کے بعد ایک لمبا چوڑا منصوبہ تیار کیا گیا۔ جو کہ سراسر ارغان کے ذہن کی اختراع تھا۔ وہ ہمیشہ سے ہی ان باتوں میں ماہر تھا۔ اس منصوبے کی تیاری کے بعد مجھے کئی ماہ تک تھرڈ کلاس قسم کے غنڈوں کے ساتھ بھیس بدل کر رہنا پڑا تاکہ میں ان کے طور طریقوں سے اچھی طرح واقف ہو سکوں اور ان ہی میں سے ایک لگوں۔ اس کے بعد وہاب حسن پر ایک جعلی حملہ کروایا گیا جس کے بارے میں فیضان کو یقین تھا کہ وہ مافیا کے گروہ میں ریڑھ کی ہڈی کی حیثیت رکھتا ہے اس حملے میں، میں نے جان پر کھیل کر وہاب کی جان بچائی اور حسب توقع میری اس کارکردگی پر اس نے مجھے اپنے انتہائی نچلے درجے کے کارندوں میں شامل کر لیا اور ظاہر ہے اس کے بعد اس کا اعتماد حاصل کر لینا میرے لیے کچھ خاص مشکل نہیں تھا۔ اگرچہ اس میں بہت وقت لگا۔ بعض اوقات پولیس کو چکمہ دے کر اس کا "مال" بھی پار کروایا اس تمام عرصے میں ایس پی فیضان کے ساتھ میرا انتہائی خفیہ تعلق قائم رہا۔ پھر ایک وقت ایسا بھی آیا کہ میری "کارکردگی" کے پیش نظر وہاب اپنی ذاتی زندگی کے مسائل مجھ سے ڈسکس کرنے لگا میرا شمار اس کے چند ایک خاص آدمیوں میں ہونے لگا۔ پھر یہ طویل جدوجہد اس وقت اختتام کو پہنچی جب ایک روز شراب کے نشے میں دھت وہاب حسن کے منہ سے میں نے میزاب کا نام سنا۔"

غیر ارادی طور پر احمر کی نگاہیں میزاب کی طرف اٹھ گئی تھیں۔

وہ بہت سہمے ہوئے انداز میں اس کی بات سننے میں پوری طرح محو تھی، نگاہوں کے اس تصادم پر گھبرا کر پلکیں جھکا گئی۔ احمر طویل سانس لے کر اپنی نشست سے اٹھ کھڑا ہوا تھا۔ یہ چند لمحوں کی سرسراتی ہوئی خاموشی میزاب کو بری طرح کھل رہی تھی۔

"یہ نام کسی چابک کی طرح میرے شعور کے پردے پر لگا تھا۔ میں بری طرح چونک گیا تھا مگر سمجھ نہیں پایا کہ اس نام میں ایسی کون سی خاص بات ہے۔ جو مجھے بے چین کر گئی ہے میں ایک بار پھر اپنی پوری حسیات کے ساتھ وہاب کی طرف متوجہ ہو گیا تھا۔ مگر وہ ایک بار پھر شراب چڑھانے میں مصروف ہو گیا تھا میں اس نام میں دلچسپی نہیں لینا چاہتا تھا مگر یہ نام ایک کیڑے کی صورت میرے دماغ میں کلبلانے لگا تھا۔ سو میں وہاب سے پوچھے بغیر نہیں رہ سکا۔"

"سر! یہ میزاب کون ہے؟"

وہ ہوش میں ہوتا تو شاید اسے میری گستاخی سمجھتا مگر اس وقت بہت لہک لہک کر وہ مجھے میزاب کے

بارے میں بتانے لگا تھا۔ میزاب سکندر۔ نفیسہ یہ تین نام ایک تکون بن کر میرے سامنے آئے تھے جس کے ایک سرے سے دوسرے سرے تک دوڑتے دوڑتے میں ہانپنے لگا تھا۔

"یہ کون لوگ ہیں؟"

"میرا ان سے کیا تعلق ہے؟"

میں بری طرح الجھ کر رہ گیا تھا۔ مگر یہ بھی جان گیا تھا کہ میرا ماضی کسی نہ کسی طرح ان ناموں سے وابستہ ہے۔ میں ان ہی سوچوں میں غلطاں و پیچاں تھا جب وہاب حسن نے اپنا گلاس دیوار پہ دے مارا۔ ایک چھناکے سے اس کی کرچیاں زمین پر بکھر گئی تھیں اور ایسا ہی ایک چھناکا میرے دماغ میں بھی ہوا تھا۔ ذہن پر جمی برف یک لخت ہی چٹخ گئی تھی۔

احمر یہاں احمر نامی شخص کو وہاب جی بھر کے گالیوں سے نواز رہا تھا۔

"وہ بد بخت کہتی تھی' میزاب احمر کی امانت ہے۔ جہنم رسید کر دیا میں نے اس کمینے کو۔ لاش تک سڑ گئی اس نامراد کی ہاہا۔" اس کا رعونت بھرا مغرور لہجہ مجھے اندر تک سلگا گیا تھا۔

بس چند لمحے لگے تھے مجھے' کاشان سے احمر تک واپسی کے سفر میں اور اس وقت مجھے لگا تھا میری رگوں میں خون کے بجائے آگ گردش کرنے لگی ہے۔ کوئی گرم سیال مادہ میرے پورے وجود کو بھسم کرتے ہوئے مجھے اس بات پر مجبور کر رہا تھا کہ میں اس شخص کا گلا اپنے ہاتھوں سے دبا دوں۔ مگر خدا کا شکر ہے کہ میری عقل میرے جذبات پر حاوی ہو گئی ورنہ شاید لمحوں میں بنا بنایا کھیل بگڑ جاتا۔ میرے لیے مزید اس کھیل کو جاری رکھنا ممکن نہ تھا سو میں ایس پی کی تمام شرائط سے انحراف کرتے ہوئے وہاب حسن کو اپنے ساتھ لے کر اس کے گھر پہنچ گیا۔ یہ پہلی مرتبہ نہ ہوا تھا۔ اس سے پہلے بھی میں اکثر اسے نشے کی حالت میں اس کے بیڈ روم تک چھوڑنے جاتا تھا مگر اس روز میں فوری طور پر اس کے بیڈ روم سے واپس نہیں آیا تھا۔ پورے کمرے کی تلاشی کے بعد میں اس کا انتہائی خفیہ سیف تلاش کرنے میں کامیاب ہو گیا اور پھر وہ تمام ثبوت' وہ تمام کاغذات اس سیف سے نکال کر میری جیکٹ کی اندرونی جیب میں منتقل ہو چکے تھے۔ اگرچہ میرے اس فوری رد عمل پر مجھے ایس پی فیضان کی زبردست جھاڑ اور ارغان کی خفگی کا سامنا بھی کرنا پڑا کیونکہ وہ کاغذات یا ثبوت وہاب حسن کی گرفتاری کے لیے ناکافی بھی ہو سکتے تھے مگر وہاب حسن کی بد قسمتی اور میری خوش قسمتی کہ ایسا نہیں ہوا اور جب ایس پی فیضان گرفتاری کے وارنٹ لیے وہاب حسن کے سر پر پہنچا تو اس وقت وہ نشے میں دھت تھا۔ یوں وہ اس بری طرح پھنسا ہے کہ کم از کم اس روئے زمین پر اس کے لیے کوئی جائے پناہ نہیں بچی' اپنی یادداشت کے بحال ہوتے ہی میں نے جب آپ کی تلاش میں نکلنا چاہا تو تب مجھے یہ مژدہ سنایا گیا کہ نہ صرف آپ لوگوں کا موجودہ ٹھکانا علم میں آ چکا ہے بلکہ میزاب مجھے دیکھ پہچان کے مراحل بھی طے کر چکی ہے۔" اس کی بات تمام ہونے پر میزاب نے سر اٹھا کر دیکھا۔ دیوار سے ٹیک لگائے' دونوں ہاتھ سینے پہ باندھے وہ نجانے کیا سوچ رہا تھا۔

"اور دیکھو ذرا' میزاب نے مجھ سے ذکر تک نہیں کیا۔" ماما کے ساکت وجود میں جنبش ہوئی تو ان کے لہجے میں تعجب تھا۔ جیسے انہیں یقین نہ ہو کہ میزاب اتنی بڑی بات ان سے چھپا بھی سکتی ہے۔ جواباً وہ کچھ نہیں بولی۔ چپ چاپ دونوں گھٹنوں کے گرد بازو لپیٹے بیٹھی رہی۔ تب ماما ایک گہری سانس لے کر چارپائی پہ لیٹ گئیں۔

"کیا کچھ ہو جاتا ہے اس چھوٹی سی زندگی میں۔ یہ جو کچھ ہم سب کے ساتھ ہوا کیا ہم نے کبھی سوچا تھا کہ ایسا ہو سکتا ہے مگر یہ سب ہوا کیونکہ یہ ہونا ہی تھا۔ یہ مشقت ہم سب کو جھیلنی ہی تھی کیونکہ یہ ہمارے نصیب میں لکھی جا چکی تھی۔" ماما نے وہی کہا تھا جو اس وقت وہ دونوں سوچ رہے تھے۔

"بہت رات ہو گئی ہے آنٹی! اب آپ آرام کریں۔" احمر نے آگے بڑھ کر جھکتے ہوئے ان پر چادر

درست کی۔

"ہاں، بہت راتیں جاگ کر گزاری ہیں۔ آج سکون کی نیند سوؤں گی، بہت اچھی میٹھی نیند۔ ورنہ یہ خیال تو دل میں کانٹا بن کر گڑا رہتا تھا کہ اگر تم ہمیں مل نہ پائے تو میزاب کی کشتی یونہی بھنور میں ڈولتی رہے گی، کبھی ساحل پہ نہ پہنچ پائے گی۔" ان کی ماتا بھری نظروں نے احمر کے ایک ایک نقش کو بہت محبت سے چھوا تھا۔

"کشتی تو شاید تاعمر بھنور میں ڈولتی رہے گی ماما! ساحل کو ترستی رہے گی۔"

میزاب نے خاموش نظروں سے احمر کا جائزہ لیا جس کے چہرے پہ ایک لمحے کے لیے کوئی سایہ سا گزرا تھا۔

پنکھے کی رفتار تیز کر کے باہر جاتے ہوئے احمر نے اشارتاً" اسے اپنے ساتھ آنے کو کہا تھا۔ وہ چند لمحے شش و پنج میں پڑنے کے بعد انگلیاں چٹخاتے ہوئے باہر نکلی تو احمر صحن میں بان کی کھری چارپائی سر جھکائے بیٹھا تھا۔ قدموں کی آہٹ پر اس نے سر اٹھا کر میزاب کی سرخ متورم آنکھوں کا بغور جائزہ لیا۔ آج کی ساری رات باتوں اور آنکھوں میں کٹی تھی اور اس وقت اس کے گالوں کو نرمی سے چھوتے باد نسیم کے سبک خرام جھونکے اس بات کا سندیسہ دے رہے تھے کہ اجالا کچھ زیادہ دور نہیں۔

"بیٹھ جاؤ میزاب!" اس کے کہنے پر وہ چارپائی کے کنارے پر ٹک سی گئی۔

احمر نے طویل سانس لے کر آنگن میں پھیلی موتیے اور بیلے کی خوشبو اپنے اندر اتارتے ہوئے اپنی نظریں اس کے اترے اترے چہرے پہ ٹکائیں تو وہ خوامخواہ ہی نظریں چرا کر ہاتھ کی لکیروں میں الجھنے لگی۔

کیسی عجیب بات تھی۔ یہ تنہائی، یہ خاموشی، یہ صبح کے اولین لمحات کا کیف آگیں سرور جوان کے مابین رشتے کے حوالے سے بہت معنی خیز ہونا چاہیے تھا، اس وقت ان دونوں کو بے حد ڈسٹرب کر رہا تھا۔

نہ جذبات میں ہلچل تھی نہ دھڑکنیں بے ترتیب تھیں۔

نہ دلوں میں امنگ تھی نہ سانسوں میں ترنگ۔

ایک عجیب لاتعلقی، ایک گریز تھا جو ان دونوں کے دل و دماغ پر حاوی ہو رہا تھا۔

"میزاب!" احمر کی آواز پر وہ چونکی۔

"ساری بات بتانے کے باوجود ایک حقیقت ایسی ہے، جو میں چاہنے کے باوجود آنٹی کو نہیں بتا سکا۔ لیکن جس طرح تم نے ان تمام حالات کا ڈٹ کر مقابلہ کیا ہے، میں امید کرتا ہوں کہ تم میری بات کو بہتر انداز سے سمجھ سکتی ہو۔"

اس کے قدرے توقف پر میزاب کو کسی غیر معمولی پن کا احساس ہونے لگا۔

"اگرچہ یہ وقت اس بات کے لیے مناسب نہیں۔ ہو سکتا ہے میں یہ بات قبل از وقت کہہ رہا ہوں مگر ایسا صرف اذیت کے اس احساس کو کم کرنے کے لیے ہے جو لحہ بہ لحہ بڑھتا ہی جا رہا ہے۔" وہ بے چین سا ہو رہا تھا۔

"میزاب! یہ وقت جو ہم لوگوں نے گزارا ہے، بہت تکلیف دہ تھا اور میرے لیے تو اس لحاظ سے ناقابل برداشت تھا کہ میں خود اپنے آپ کو پہچان نہیں پا رہا تھا۔ تم اس اذیت کا اندازہ کر سکتی ہو میزاب! جس میں، میں نے ایک طویل عرصہ گزارا ہے۔ ایک باشعور انسان جو وقت پڑنے پر اپنی تمام غیر معمولی صلاحیتوں کو بروئے کار لا سکتا ہے، اسے یہ معلوم ہی نہ ہو کہ وہ کون ہے؟ کہاں سے آیا ہے؟ اس کی شناخت کیا ہے؟ تو سوچو اس کی شخصیت ان تمام حادثات سے کس طرح متاثر ہوئی ہو گی۔ میں بھی جذباتی کشمکش کا شکار ہو چکا تھا۔ اسی دوران میری ملاقات رابعہ سے ہوئی، وہ ایک بے سہارا لڑکی تھی۔

اسے ایک مضبوط سہارے کی تلاش تھی اور میں جذباتی پناہ کا متلاشی سو ہم دونوں نے شادی کر لی۔" احمر نے مجرمانہ انداز میں اعتراف کیا۔

"نکاح انتہائی سادگی سے ہوا تھا اور میں محسوس کر رہا تھا کہ کوئی چیز ہے جو مجھے یہ سب کرنے سے روک

رہی ہے۔ مگر۔" ایک لمحے کے لیے توقف کرتے ہوئے اس نے میزاب کے جذبات کا اندازہ لگانا چاہا۔

اور میزاب کے لیے تو یہ انکشاف اس حد تک غیر متوقع تھا کہ وہ بس ایک ہی زاویے سے اس پر نظر ٹکائے بیٹھی رہ گئی تھی۔ اس کی سمجھ میں ہی نہیں آرہا تھا کہ اس خبر پر اسے کس ردعمل کا مظاہرہ کرنا چاہیے۔

میزاب کے اس پتھرائے پتھرائے وجود سے نظریں چرا کر وہ اٹھ کھڑا ہوا۔

"یہ' یہ سب انجانے میں ہوا میزاب! تم سمجھ رہی ہو نا؟ میں نے جان بوجھ کر ایسا نہیں کیا تھا مگر یہ سب ہو گیا اور اب۔ اب میری سمجھ میں نہیں آرہا کہ مجھے کیا کرنا ہو گا۔" اس کا اندرونی خلفشار اور کشمکش اس کے چہرے سے عیاں تھی۔

"میں جانتا ہوں' دو کشتیوں کا سوار کبھی منزل پر نہیں پہنچ پاتا لیکن' لیکن میں رابعہ کو نہیں چھوڑ سکتا۔" احمر کی آواز بھرا گئی تھی۔

"وہ مجھ پر جان چھڑکتی ہے اور میں بھی اسے خود سے جدا نہیں کر سکتا میزاب! ہم سب لوگ ایک نئی زندگی شروع کرنے جا رہے ہیں۔" وہ ایک دم اس کے سامنے زمین پر پنجوں کے بل بیٹھ گیا تھا اور بے اختیار و بلا ارادہ ہی اس کے سرد ہاتھوں کو اپنے ہاتھوں میں جکڑ لیا تھا۔

"ہمارے نکاح کا علم بہت کم لوگوں کو تھا اگر میں کوئی خود غرضانہ فیصلہ کر بھی لوں تو وہ تمہاری آئندہ زندگی پر اثر انداز نہیں ہو سکے گا۔ لیکن اس کے باوجود میں فیصلے کا حق تمہیں سونپتا ہوں۔" وہ بھیگی آنکھوں سمیت اس سے گویا التجا کر رہا تھا کہ وہ اس پر اور رابعہ پر رحم کرے اور پھر نجانے کتنے لمحے بیت گئے۔ احمر ایاز کی دھندلائی آنکھیں اس مجسمے کا طواف کرتی رہیں اور تب ہی شاید کسی فیصلے پر پہنچ کر اس کے ساکت و صامت وجود نے جھرجھری لی تھی اور اس کے ساتھ ہی اس نے دھیرے سے اپنے ہاتھ واپس کھینچ لیے تھے۔

"تم نے بالکل درست کہا تھا احمر ایاز! دو کشتیوں کا مسافر کبھی منزل تک نہیں پہنچ پاتا۔" اس کے ہونٹوں میں جنبش ہوئی تھی اور احمر کا دل سماعت بن کر دھڑکنے لگا تھا۔

"یوں لگتا ہے میرے اور تمہارے سنجوگ کا فیصلہ انسانوں کا فیصلہ تھا۔ کاتب تقدیر نے ہمارے لیے جو لکھا' وہ کچھ اور تھا اور تقدیر سے انحراف نہ تم کر سکتے ہو نہ میں۔ سو احمر ایاز! میں خود تم سے اپنی آزادی طلب کرتی ہوں۔" وہ بہت ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہہ رہی تھی اور احمر حیرت و بے یقینی کے سمندر میں غرق ہوا جا رہا تھا۔

"حیران مت ہو احمر! فیصلے میں اتنی جلدی اس لیے کی ہے کہ ابھی وقت میری مٹھی میں ہے اور میں دیر نہیں کرنا چاہتی۔" اس کے ہونٹوں پر آسودہ لیکن تھکن زدہ مسکراہٹ تیر رہی تھی۔

احمر نے تشکرانہ لیکن خاموش نگاہ اس کے چہرے پہ ڈالی اور اٹھ کھڑا ہوا۔

"اجالا پھیل رہا ہے احمر! تم جا کر رابعہ کے ساتھ تیاری کرو۔ ہم سب اکٹھے گھر جائیں گے۔"

اس کے کہنے پر احمر کے ہونٹوں پہ بے اختیار ہی جان دار سی مسکراہٹ ابھری اور وہ اثبات میں سر ہلا کر بیرونی دروازے کی طرف چل دیا تھا۔

"میں نے تم سے محبت نہیں کی احمر! نہ تمہیں چاہا ہے ہاں مگر تمہیں سوچا بہت ہے۔" اس نے احمر کی چوڑی پشت پہ نظر جما کر ایک لمحے کے لیے سوچا اور پھر جیسے تھک کر بستر پہ سیدھی لیٹ کر اس نے اپنی نظریں آسمان پر جما دیں جہاں رات کی سیاہی تیزی سے دن کے اجالے میں تبدیل ہو رہی تھی۔ اس نے کہیں پڑھا تھا۔

"کچھ لمحے بڑے فیصلہ کن ہوتے ہیں۔ اس وقت یہ طے ہوتا ہے کہ کون شخص کس کا سیارہ بنایا جائے گا۔ اس طرح کوئی خاص گھڑی بڑی نتیجہ خیز ہوتی ہے۔ اس وقت ایک قلب کی سوئیاں کسی دوسرے قلب کے تابع کر دی جاتی ہیں۔ پھر جو وقت پہلے کا رہتا ہے

وہی وقت دوسرے قلب کی گھڑی بتاتی ہے۔ جو موسم جو رت جو دن پہلے قلب میں طلوع ہوتا ہے وہی دوسرے کے آئینے میں منعکس ہوتا ہے۔
اور مجھے لگتا ہے بہت اوپر آسمانوں میں جب میری حیات کا فیصلہ رقم کیا گیا تھا تو میرے قلب کو ارغان حسن بختیار کے قلب کے تابع کر دیا گیا تھا اور جب اس کے دل میں میری محبت کا موسم آن ٹھہرا تھا تو میرا دل اس موسم کا عکس کیوں نہ بنتا۔"

چنبیلی کی نرم خوشبو سے بوجھل ہوا اسے دھیرے دھیرے تھپک رہی تھی۔ اس کی خمار آلود پلکیں لحظہ بھر کو بند ہوئی تھیں۔ جب کوئی شبیہہ خواب کے سرسراتے پردے پر جھلملائی۔

"میں نے محبت کی ہے' بے تحاشا محبت' عشق کی سرحدوں کو چھوتی ہوئی۔ اپنے جذبوں کی عمیق گہرائیوں اور دل و جان کی تمام تر سچائیوں کے ساتھ چاہا ہے۔ جانتی ہو کسے؟"

اور اس کی پلکیں پل بھر میں ایک دوسرے سے جدا ہو گئی تھیں۔ چمکتی مسکراہٹ سورج کی اولین کرنوں کی طرح اس کے چہرے کا احاطہ کر گئی تھی اور اسے اس سوال کا جواب دینے میں کوئی مشکل درپیش نہ تھی۔

♥ ♡ ♡ ♥

وہ دھیرے دھیرے قدم اٹھاتی فٹ پاتھ پر چلی جا رہی تھی۔ آج اسکول میں اس کا آخری دن تھا۔ آتے ہوئے اس نے اپنی آخری تنخواہ "پیپلی والے سائیں" کے کشکول میں ڈال دی تھی اور انسیت کے احساس سے چور ہوتے ہوئے کہا تھا۔

"میں اس شہر سے جا رہی ہوں سائیں۔"

"لوٹ کر یہیں آنا ہے۔" سائیں کا پر یقین لہجہ اسے حیران کر گیا۔

"سائیں کو ہربات کا اشارہ مل جاتا ہے بیٹی! یقیناً تمہارا دانہ پانی اس شہر سے ختم نہیں ہوا۔" پاس کھڑے ایک شخص نے گویا وضاحت کی۔

اور وہ دل ہی دل میں سائیں کی معترف ہوتی آگے بڑھ گئی۔ چند قدم آگے جا کر اسے احساس ہوا کہ سلور گرے کرولا انتہائی سست روی کے ساتھ اس کے عین برابر چلی آ رہی ہے۔ اس نے گردن موڑ کر ڈرائیونگ سیٹ پہ بیٹھے شخص کو دیکھا جو اپنی نظریں اس پہ گاڑے بیٹھا تھا۔

نجانے کیوں اس کا دل چاہا تھا' اسے تنگ کرنے کو اسے کوئی رسپانس دیے بغیر وہ ناک کی سیدھ میں چلتی رہی۔ کچھ دور جانے کے بعد اسے احساس ہوا کہ گاڑی رک گئی تھی۔ چند لمحے بعد دروازہ کھلنے اور بند ہونے کی آواز سن کر اس کا دل پوری قوت سے دھڑکا تھا۔

بھاری قدموں کی آواز دور سے نزدیک اور نزدیک سے نزدیک تر ہوتی چلی گئی یہاں تک کہ "شنیل" کی مسحور کن مہک اس کے وجود کے گرد گھیرا تنگ کرنے لگی۔ اضطراری انداز میں ہونٹ کاٹتے ہوئے وہ منتظر ہی رہی کہ وہ ابھی کچھ کہے گا مگر دوسری جانب مکمل خاموشی تھی۔

تیز ہوا سے پھڑپھڑاتے آنچل اور چہرے پہ آئے بالوں کو سمیٹتے ہوئے اس نے چڑ کر اس کی طرف دیکھا۔

"کچھ کہتے کیوں نہیں۔"

"ڈر لگتا ہے۔"

"ڈر کیسا؟" اس نے حیرت سے اسے دیکھا جس کے چہرے پہ مکمل سنجیدگی تھی اور براؤن آنکھوں میں چمکتے شہد کی سی روشنی نظر آ رہی تھی۔

"آپ کی خفگی کا ڈر۔ ہر دفعہ' ہر بات کے جواب میں آپ کی ڈانٹ ڈپٹ کے سوا کچھ ہاتھ نہیں آیا اور یہ میرے سینے میں دھڑکتا بیچارا معصوم سا دل آپ کی مزید خفگی افورڈ نہیں کر سکتا' اس لیے تو آپ کو لفٹ کی آفر دینے کے بجائے خود فٹ پاتھ پر مارچ کرنے لگا ہوں۔" شرارت آمیز معصومیت سے وہ بولنے پر آیا تو بولتا ہی چلا گیا۔

"آپ ایسی حرکتیں کرتے ہی کیوں ہیں۔"

"کیسی حرکتیں؟" وہ قدرے حیران ہو کر اسے

دیکھنے لگا۔
"دوسروں کو ناراض اور خفا کرنے والی۔" اس نے بالوں کی لٹ کانوں کے پیچھے اڑسی۔
"اس لیے کہ مجھے "منانے" والی "حرکتیں" بھی خوب آتی ہیں۔" اس کا معنی خیز لہجہ میزاب کو بری طرح سرخ کر گیا اور وہ اس کے صبیح چہرے پہ پھیلتی حجاب آمیز سرخی کو دیکھتا رہ گیا تھا۔
"ایسے کیا دیکھ رہے ہیں؟" نگاہوں کی تپش اسے بوکھلائے دے رہی تھی۔
"آپ جانتی ہیں میزاب!" وہ اچانک اس کے سامنے آگیا تو اسے مجبوراً رکنا پڑا۔
"جب میں نے پہلی مرتبہ آپ کو دیکھا تھا تو میں ساری رات سو نہیں پایا تھا اور میرے ساتھ ایسا پہلی مرتبہ ہوا تھا۔ عجیب بے قراری و بے چینی میری روح میں سما گئی تھی۔ مجھے معلوم بھی نہ ہو پاتا اور میں کئی گھنٹے آپ کے تصوّر میں بتا دیتا اور کتنی عجیب بات ہے کہ اس تمام عرصے میں آپ سے دوری کا خیال ایک لمحے کے لیے بھی میرے دل میں نہیں آیا۔ میں نے کبھی سوچا ہی نہیں تھا کہ آپ کسی اور کا نصیب بھی ہو سکتی ہیں۔ احمر ایاز سے آپ کے تعلق کا علم ہو جانے کے بعد بھی میں بے یقین نہ تھا۔ بھلا یہ کیسے ممکن ہے کہ وہ جو میرے اندر روح بن کر سما چکی ہے' وہ مجھ سے دور چلی جائے اور بھلا یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ آپ کسی فرد کو خود سے بڑھ کر چاہیں اور پھر بھی اسے پا نہ سکیں۔"
"اور مجھے لگتا ہے میزاب! یہ میرا یقین تھا جس کی بدولت میں نے آپ کو پا لیا ورنہ بظاہر تو یہ ممکن نہ لگ رہا تھا۔"
قریب سے گزرتے کسی من چلے نے انہیں دیکھ کر زور سے سیٹی بجائی تھی۔ دونوں ایک ساتھ چونکے تھے اور میزاب بری طرح جھینپ گئی۔
"لوگ ہماری طرف متوجہ ہو رہے ہیں۔"
"ارے واہ میں آپ کو اپنے بے مثال عشق کی داستان سنا رہا ہوں اور آپ لوگوں کی پروا کر رہی ہیں۔ جانتی ہیں اگر کوئی اس وقت مجھ سے پوچھتا کہ میزاب کون ہے تو میں اسے کیا جواب دیتا۔" اس نے قدرے جھک کر اس سے پوچھا۔
"کیا؟" اس کی سیاہ آنکھوں میں اشتیاق ابھرا۔
"یہ ہی کہ سورج کی اولین کرن میزاب ہے۔
وہ بارش کا سب سے پہلا قطرہ ہے جو میرے دل کے صحرا پہ برسا ہے اور چاروں طرف پھول ہی پھول مہکا گیا ہے۔
چاند کی روپہلی کرنیں میزاب کا دوسرا روپ ہیں۔
وہ صحرا کے سینے پہ ڈولتی چاندنی کا عکس ہے۔
"مسٹر ارغان!" اسے جذبات کی رو میں بہکتے دیکھ کر وہ بے اختیار اسے ٹوک گئی۔
"آپ کو کب عقل آئے گی؟"
"کیا ہوا؟" وہ حد درجہ حیران تھا۔
"آپ نے یہ نہیں سوچا کہ محبت کا ایسا خوب صورت اظہار اس چلچلاتی دھوپ میں کیسا لگے گا۔"
"اوہ" آئی ایم سو سوری۔" اسے احساس ہوا کہ دھوپ درختوں کے پتّوں سے چھن چھن کر براہ راست ان پر پڑ رہی تھی۔
"میں ہوں ہی کم عقل اور نادان ہمیشہ درست بات غلط وقت پر کہہ دیتا ہوں۔" اس نے سر کھجاتے ہوئے بے چارگی سے کہا تو وہ بے اختیار ہنس دی۔
وہ چند لمحے یونہی کھڑا اسے دیکھتا رہا اور پھر خود بھی اس کے ساتھ ہی مسکرا دیا۔
"آیئے مادام۔" چند قدم پیچھے پلٹ کر گاڑی کا دروازہ کھولتے ہوئے اس نے قدرے جھک کر کہا تو وہ ہنستی ہوئی گاڑی میں بیٹھ گئی۔ چند لمحوں بعد گاڑی وہاں سے روانہ ہو گئی تھی لیکن وہاں رہ جانے والی فضا محبت کے بولوں سے مہکتی رہی تھی۔